ماہنامہ

قومی زبان

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ۔ کراچی نمبر ۱

ماہنامہ

قومی زبان

کراچی

نومبر ۱۹۸۰ء

جلد ـــــ ۵۰

شمارہ ـــــ ۱۱

قیمت فی پرچہ ـــــ ایک روپیہ پچاس پیسے

سالانہ قیمت ـــــ پندرہ روپے

بیرون ملک ـــــ ستائیس روپے

★

انجمن ترقی اردو پاکستان

بابائے اردو روڈ۔ کراچی نمبر ۱

فون : ۲۱۷۱۳۷

فہرست

اداریہ		۲
اقبال آہنگ اور انفرادیت	ڈاکٹر احمد سجاد	۵
کتابیاتِ اقبال	صابر کلوروی	۱۱
اقبال اور پیغام انسانیت	ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی	۱۷
اقبال اور پختون	محمد پرویش شاہین	۲۳
اقبال اور مشاہیر عالم کی نظر میں	دردانہ جلیل	۲۸
اقبال کا ایک شعر	ڈاکٹر ریاض الحسن	۳۲
حافظ محمود شیرانی	عبد القادر سروری	۳۴
محمود شیرانی اور ان کے مقالات	نثار الحق صدیقی	۳۸
افسانہ نگار اور اخلاقی پابندی	احمد خان خلیل	۴۴
تاریخ پسرور	ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین	۴۸
نئے خزانے	ابو سلمان شاہجہان پوری	۵۳

ادارۂ تحریر

جمیل الدین عالی

سید شبیر علی کاظمی

اداریہ

۹ نومبر علامہ اقبالؒ مفکرِ پاکستان کا یوم پیدائش ہے اور حُسنِ اتفاق کہ چودھویں صدی ہجری کا اختتام بھی اسی دن ہوا۔ اس چودھویں صدی کا آغاز جہاں تک سود و زیاں کا تعلق ہے۔ سر سیّد اسکول کے عہدِ شباب میں ہوا تھا۔ اس کی انتہا حکمت اقبال کے عہد میں ہوئی۔ برصغیر پاک و ہند میں گزشتہ صدی ہجری کے صد سالہ سفر کا آخری تین چوتھائی حصہ فکر اقبال سے متاثر و مزیّن نظر آتا ہے۔ جنوبی ایشیا میں یہ صدی آزادی افکار اور استعماریت کے خلاف جد و جہد کی کامیابی کے لیے خاص نمایاں رہی جس میں اردو زبان نے اپنا فریضہ بطریقِ احسن ادا کیا۔ گو ہندو سیاسی اغراض نے اس حقیقت کے اعتراف سے زبانی اور عملی طور پر کھلّم کھلّا روگردانی کی لیکن اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ صدی اردو زبان کے عروج کا عہد تھی۔ پندرہویں صدی ہجری میں اُردو زبان اپنے ملک میں مستحکم ہو کر بین الاقوامی سطح پر بھی نمایاں اور اجتماعی وجدان اور نئی فتوحات کی راہ ہموار کرنے میں معاون ہوگی۔ ثقافتی معیار سے یہ اپنے بولنے والوں کی صحیح ترجمان اور عصبیت سے بالکل بے نیاز ہے اب ہمیں اپنی قومی زبان کی فطرت و مزاج اور وقت کے مطالبات کے تحت اظہارِ بیان کے وہ پیرائے اختیار کرنے ہیں جو سائنسی ضرورتوں کے کفیل ہوں اور تجارتی و صنعتی مطالبات کو پورا کرتے ہوں۔ الفاظ کے انتخاب اور استعمال میں فنکارانہ صلاحیت کے ساتھ عوامی سطح کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے۔ یہ سائنسی دور ہے اور انسانی اعمال سائنسی انکشافات سے متاثر ہو رہے ہیں۔ عمومی فلاح کی اساس اتحاد ہے اور معلومات اطلاعات اور ذرائع ابلاغ بظاہر انسانی بہبود کے علمبردار ہیں مگر ان میں شائبے بھی مضمر ہوتے ہیں۔ پندرہویں صدی میں انسانی ذمہ داریاں کچھ عجیب نوعیت کی ہیں۔ صنعتی میدان میں جدید دریافتوں نے پیداوار میں اضافے کر دیے ہیں مگر معاشرے کی ذہنی اور ثقافتی صلاحیت جس سے ترقی کے تمام اثرات کو قابو میں رکھا جا سکتا ہے کم ہوتی نظر آتی ہے انسان ان تبدیلیوں کی راہ میں حائل بھی نہیں ان پر پوری طرح قابض بھی نہیں البتہ سائنسی اور تکنیکی تبدیلیوں کو پوری طرح اپنی روزانہ زندگی میں ضم کر لینے سے عاجز معلوم ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں روحانی اور ثقافتی وحدت خطرے میں ہے۔ بعض دریافتیں مختلف منطقی ضابطوں کی غیر استدلالی پیداوار ہیں جن سے افراد اور اقوام میں غیریت کا احساس بڑھتا جا رہا ہے۔ پندرہویں صدی ہجری میں حکمت اقبال دنیا کی رہنمائی کر سکتی ہے جو آفاقی ہے اور اسلام کی تعلیمی روشنی میں پیش کی گئی ہے۔ اور ان کے قول کے مطابق ؎

یہ حکمت ملکوتی یہ علم لاہوتی　　　حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

قومی زبان اکتوبر ۱۹۸۰ء شیرانی نمبر تھا۔ اس کی تیاری میں وقت لگا اور اشاعت میں تاخیر ہوگئی جس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔ طباعت کی راہ میں کتابت کا مرحلہ ناقابل عبور ہوتا ہے۔ ارادہ ہے کہ انجمن کی مطبوعات کو خط نسخ کے ٹائپ میں طبع کیا جائے لیکن اس میں بھی کمپوزنگ اور تصحیح کے اخراجات بہت زیادہ ہوجائیں گے۔ انجمن اپنی مطبوعات کی قیمت مناسب رکھتی ہے اور پرانی مطبوعات کی قیمت میں کسی قسم کا اضافہ نہیں کیا ہے۔ کتب فروشوں کو کمیشن بھی مناسب دیا جاتا ہے اس طرح ہمارے اخراجات میں ہر طرح اضافہ ہو رہا ہے۔ سرکاری گرانٹ محدود ہے۔ ہم توقع کرتے ہیں کہ حالات کے پیش نظر حکومت ہماری گرانٹ میں معتدبہ اضافہ کرے گی۔

---

۲۷ اکتوبر ۱۹۸۰ء کے اخبار جنگ سے معلوم ہوا کہ دور موجودہ کے معروف و نامور شاعر جناب ساحر لدھیانوی ۲۴ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو راہی ملک عدم ہوئے۔ مرحوم کا انتقال ہمارے لیے ایک ادبی حادثے سے کم نہیں کیونکہ مرحوم نے اپنی فنکارانہ صلاحیت سے معاصرین میں اپنا ایک مقام پیدا کر لیا تھا ان کی نظمیں نہایت دل پسند ہوتی تھیں اور عوام و خواص دونوں میں مقبول تھیں اس انداز کے لکھنے والے ملک میں گنے چنے ہیں اور بظاہر ان کی کمی کو خاص طور پر محسوس کیا جائے گا ادارہ قومی زبان ان کی مغفرت کے لیے دعاگو ہے۔

اردو دنیا کو یہ خبر سن کر سخت صدمہ ہوا کہ پاکستان کے ایک معروف و مشہور ادیب اطہر علی خان نفیس ۲۱ نومبر ۸۰ء کو اس دار فانی سے رخصت ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم ضلع آگرہ میں پیدا ہوئے تھے اور ضلع علی گڑھ میں تعلیم پائی تھی ۱۹۴۹ء میں پاکستان آجانے کے بعد کراچی میں مقیم ہوگئے اور اخبار جنگ میں فکاہی کالم لکھنے لگے جس کی وجہ سے خاصے مقبول ہوئے وہ ایک کامیاب شاعر بھی تھے اور ان کے دو شعری مجموعے ہیں پہلا مجموعۂ کلام کے نام سے چھپ چکا ہے اور دوسرا مجموعہ زیر ترتیب تھا کہ انھوں نے ۸۰ سال کی عمر میں داغ مفارقت دے دیا۔ ادارہ قومی زبان ان کی مغفرت اور تمام پسماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔

اقبال — آہنگ اور انفرادیت

ڈاکٹر احمد سجاد

ادب میں صوتی اور لسانی مزاج کو اس کے آہنگ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگر ہم علمی نقطۂ نظر سے اس موضوع پر غور کریں تو آہنگ اور انفرادیت کو کسی شاعر اور ادیب کی تنہا ملکیت نہیں پائیں گے بلکہ دیکھیں گے کہ ہر انسان جو اپنے منہ میں زبان رکھتا ہے اس کی گفتگو کا مجموعی مزاج یا آہنگ دوسرے سے بہر حال مختلف اور منفرد ہوگا۔ کیونکہ صوتیات کے مطالعہ اور انتہائی ذکی الحس آلہ کائموگراف کی تصویروں سے یہ حیرت انگیز انکشاف ہو چکا ہے کہ کسی لفظ بلکہ کسی حرف یعنی آواز کو دنیا کے کوئی بھی دو آدمی یکساں طرز پر ادا نہیں کر سکتے۔ حد تو یہ ہے کہ ایک ہی لفظ یا آواز کو اگر ہم سو بار بھی دہرائیں تو اس کی ہو بہو نقل ممکن ہی نہیں کائموگراف کی تصویروں پر ہر بار اس کی لہروں کا گراف بدلا ہوا ہوگا۔[1]

بہر حال یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ آہنگ زبان کا ایک جزو لازم ہے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ شعر و ادب میں آہنگ کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں۔ اس سلسلے میں ماہرین شعر و ادب آہنگ کی دو قسموں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ داخلی آہنگ اور خارجی آہنگ داخلی آہنگ میں خیال اور جذبے کا آہنگ شامل ہے۔ خارجی آہنگ میں حروف کی غنائیت، الفاظ کا زیر و بم، ترکیبوں کی چستی اور زبان کی مختلف شکلوں کی موسیقیت فقروں نیز اوزان و بحور وغیرہ کا ترنم شامل ہیں۔ مگر آہنگ کو محض چند اصولوں اور قاعدوں تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ یہ ایک پیچیدہ نفسیاتی اور تخلیقی عمل کا جزو ہے۔ داخلی اور خارجی کی تقسیم بھی محض وقتی اور مصنوعی ہے کیونکہ یہ دونوں اصلاً لازم و ملزوم ہیں۔ ڈاکٹر عنوان چشتی نے غلط نہیں کہا ہے کہ

"اس کی (خارجی آہنگ کی) جڑیں داخلی آہنگ میں پیوست ہوتی ہیں۔ بلکہ اعلیٰ شاعری میں داخلی اور خارجی آہنگ ایک دوسرے میں تحلیل ہو کر ایک غنائی لہر بن جاتے ہیں۔"[2]

اقبال بھی "ارتباط حرف و معنی اور اختلاط جان و تن" کے قائل تھے۔ تو آیئے سب سے پہلے کلام اقبال کے داخلی آہنگ کی دریافت کی جائے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا داخلی آہنگ میں "خیال اور جذبہ" کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اور اقبال کے خیالات و جذبات کا بار بار تفصیلی جائزہ لیا جاتا رہا ہے کہ ان کی فکر خالص نظریاتی اور نصب العینی تھی۔ ان کے اساسی تصورات اسلام اور صرف اسلام پر مبنی

---

[1] لسانی مطالعہ گیان چند جین۔ ص ۸۵ نیشنل بک ٹرسٹ، دہلی

[2] تنقید سے تحقیق تک۔ ڈاکٹر عنوان چشتی۔ اعجاز پریس ص ۵۶

تھے۔ بالفاظ دیگر وہ "فن برائے زندگی اور زندگی برائے بندگی رب" کے قائل تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ ہرگز یہ نہ کہتے کہ

"شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کبھی میرا مطمع نظر نہیں رہا ہے۔ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لیے وقت نہیں۔ مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس"

انہوں نے اپنے کو "محرم رازِ درونِ میخانہ" سمجھنے کی وجہ سے اپنی شاعری کو نوائے پریشان سے تعبیر کیا ہے۔ اور اپنی ذاتی ادائے محبوبی کو بانگ صورِ اسرافیل قرار دیا ہے۔ اسی لیے ان کے نزدیک

؎ عزیز تر ہے متاعِ امیر و سلطاں سے
وہ شعر جس میں ہے بجلی کا سوز و براقی

اور ؎

وہ شعر کہ پیغامِ حیاتِ ابدی ہے
یا نغمۂ جبریل ہے یا صورِ سرافیل

؎ گر ہنر میں نہیں تعمیرِ خودی کا جوہر
وائے صورت گری و شاعری و نائے و سرود

؎ اے اہل نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

اقبال کا عقیدہ تھا کہ "قومیں شعرا کی دستگیری سے پیدا ہوتی ہیں" اسی وجہ سے میں اقبال کے داخلی آہنگ کو اسلامی یا نقیب العجم" آہنگ سے تعبیر کرتا ہوں نیز یہی کم و بیش یہی قرآنی آہنگ مولانا ابوالکلام آزاد کا بھی تھا۔ قرآن پاک معروف و منکر، اوامر و نواہی اور حق و باطل کے مسائل پر خشک منطقی انداز میں روشنی نہیں ڈالتا بلکہ ہمارے وجدان اور جذبات و عواطف کے نازک تاروں کو بھی قدم قدم پر چھیڑتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ وہ اخلاقی و انقلابی امور پر نصیحت آمیز قصوں، موثر و دل نشین حکمتوں، عمدہ مثالوں، دلکش وعدوں، مرعوب کن دھمکیوں اور جذباتی اپیلوں سے قاری کے ذہن و دماغ کو مسحور کر لیتا ہے اور اسی لیے آپ دیکھیں گے کہ قرآنی سورتوں میں جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ اس میں چھوٹی چھوٹی آیتیں، مسجع جملے، عمدہ تشبیہیں زوردار استعارے۔ معنی خیز علامتیں اور خوبصورت اشارے بھی استعمال کیے گئے ہیں۔ اگر قرآن کی مکی و مدنی سورتوں اور آیتوں پر فنی نقطۂ نظر سے غور کیا جائے تو موقع و محل اور موضوع کی مناسبت سے اس نے کہیں طویل اور کہیں مختصر جملے استعمال کیے ہیں۔ کہیں انداز بیان بالکل سادہ اور کہیں گہرا اور رنگین اختیار کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ نئے دینی الفاظ تراش کر اس نے زبان کے دائرہ کو وسیع کیا ہے مثلاً الصلوٰۃ، الآخرۃ، جنت و جہنم وغیرہ[1]

مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ اقبال کے قرآن سے شغف اور ان کے قلبی تعلق کے واقعات تو سب پر واضح ہیں اس موضوع پر سیر حاصل مقالے اور مستقل تصانیف بھی منظر عام پر آچکی ہیں۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ کلام اقبال کی دلکشی فصاحت حیرت انگیز بلاغت صاف و واضح مسلک اور پر زور و مدلل طرز بیان پر قرآنی اسلوب کا براہ راست اثر ہے۔ اگر اقبال کی پوری سیرت اور ان کے مذاق و میلان پر آپ کی نظر ہے تو ان کی شاعری میں ایک واضح مقصدیت کی گونج اور بلند آہنگی کا احساس کے سوا کوئی دوسری تاویل ممکن ہی نہیں۔

---

[1] تاریخ ادب عربی۔ استاد احمد حسن زیات (اردو ترجمہ) لاہور ص ۱۶۰

واضح ہو کہ یہ اسلامی روایت اور قرآنی اسلوب اقبال کی طرح حالی اور شبلی کو بھی ملا ہوا تھا مگر وہ ماضی کے اس شعور کو حال کے عرفان اور پھر ان دونوں کے عضوی تسلسل سے آگے نہ بڑھا سکے۔ شاعری میں زندہ اور متحرک روایت کی پیشکش تو دراصل یہی ہے کہ ماضی کو حال کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی جائے اور ماضی کے تجربات کی روشنی میں حال کے مسائل کو حسی اور جمالیاتی انداز میں حل کر کے تعمیر مستقبل کی جائے۔ ان شعرا کے مقابلے میں آہنگ اقبال کی انفرادیت اس لئے نمایاں اور موثر ہے کہ یہاں ایلیٹ کے لفظوں میں "ماضی کی ماضیت کی موجودگی کا متحرک شعور" روایت کی آگہی اور طاقتور تخلیقی وجدان کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔

اقبال کی انفرادیت کو سمجھنے کے لیے ہمیں ایلیٹ کے نہایت اہم مضمون "روایت اور انفرادی صلاحیت" کو اپنے پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اس کی روشنی میں روایت کے سلسلے میں تین رویے بالکل واضح ہیں۔ اولاً اندھی تقلید، دوم پر بصیرت اقدام سوم انحراف و بغاوت۔ اقبال نے اپنے ماحول و مزاج اور انداز تربیت کی بنا پر درمیانی راہ اختیار کر کے روایت کے مثبت عناصر کو قبول کر لیا۔ یہ اعتدال و توازن نہ کل کے حالی و شبلی کے یہاں نہ آج کے ن۔م۔ راشد اور وزیر آغا کے یہاں ہے۔ یہیں پر ان کی انفرادیت خود بخود واضح ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے کلام اقبال میں روایت کا یہ رچا ہوا شعور اور اس کے اثر سے آہنگ میں ایک آفاقی جمالیاتی اپیل نصف صدی کے بعد بھی مزید نکھرتی چلی جا رہی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ نری تقلید اور انقلابی تخریب پسندی سے بیزاری کا رنگ سفر انگلستان و یورپ کے بعد نکھرا ہے مگر تدریجی ارتقا بہر حال خوبی ہے خامی نہیں ہے

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

اقبال کی شاعری کے داخلی آہنگ کو سمجھنے کے لیے ان کے فن کے شخصی اور آفاقی عناصر کو اپنے پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں جیسا کہ عرض کیا گیا اسلامی روایات کی بنیادی اہمیت، عالمگیر اخلاقی قدروں اور اجتماعی انداز کے اسالیب نیز قابل فہم ہیئتی تجربوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے ے

زمانہ ایک حیات ایک کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصۂ جدید و قدیم

یہی گونج ان کی پوری اردو و فارسی شاعری میں ہر جگہ سنائی دیتی ہے۔ اس سلسلے میں شہد کی مکھی کی طرح عرب و عجم اور یورپ کی اعلیٰ شاعری کے مختلف پھولوں کی خوشبو اور اس کے جوہر کو کشید کر کے نئے تاثر، حسن تازگی اور توانائی کے ساتھ اقبال نے انہیں پیش کیا۔ اس ضمن میں روایتی عناصر کی نئی ترتیب اور پرانی روایتوں کے نئے امکانات کی جلوہ گری سے بھی نئی نئی جدتوں کا کام لیا ہے۔ جدت اس کے سوا اور ہے ہی کیا کہ مانوس اشیا کے مخفی امکانات کو منکشف کیا جائے۔ اب اس مخصوص سوچتے ہوئے فکری آہنگ کی جدت و انفرادیت کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

ے نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

ے خضر بھی بے دست و پا الیاس بھی بے دست و پا
میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جو بہ جو

ے رومی بدلے شامی بدلے بدلا ہندوستان
تو بھی اے فرزند کہستاں اپنی خودی پہچان

اپنی خودی پہچان او غافل افغان

ے شاعر کی نوا ہو کہ مغنّی کا نفس ہو جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

ے شیشے کی صراحی ہو کہ مٹی کا سبو ہو شمشیر کی مانند ہو تیزی میں تری مے

یا پھر ابلیس کی یہ فریاد۔

ے عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

الحذر آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں

اور اب اس ابلیسی نسخہ کے آہنگ و انفرادیت کو ملاحظہ فرمائیے۔

ے ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر
جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات

ے ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

ے مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

آپ نے دیکھا یہاں جدت برائے جدت یا جدت برائے نقالی نہیں بلکہ یہ روایت کے بطن سے پیدا ہوئی ہے مگر روایت پرستی سے منحرف ہے۔ یہ انحراف اشعار کے داخلی اور خارجی دونوں سطحوں پر نمایاں ہے۔ ڈاکٹر عنوان چشتی کے الفاظ مستعار لیے جائیں تو ایک طرف اس میں نئے موضوعات اور اسالیب شامل ہیں تو دوسری طرف پرانے موضوعات اور اسالیب کے خارجی اور داخلی پہلوؤں کے مخفی امکانات کی دریافت اور ان کی از سرِ نو تنظیم شامل ہے۔ جو قاری کو استعجاب اور سرخوشی عطا کرتی ہے" اور اس طرح کے اشعار میں عصری آگہی بھی ہے، نئی عجبت بھی اور نیا شعور بھی۔ جو اقبال سے پہلے ناپید تھا۔ اس آہنگ میں کسی باغی، جدت پرست یا ایڈونچرسٹ کی گھن گرج، شدت طاقت اور جذباتیت نہیں بلکہ احیائے ذہن کے بے زندہ عناصر کی نئی ترتیب، ایرانی چیزوں میں نئے پہلوؤں کی تلاش فوارے یا پہاڑی چشمے کا زور اور اس کا بہاؤ جن کی خوش نمائی اور نغمگی۔ ان کی افادیت سے کم اہم نہیں۔

خارجی آہنگ کے بعض نکات کی طرف ابتدا ہی میں اشارے کر چکا ہوں اس آہنگ کو دل نشیں اور پُراثر بنانے کے لیے اقبال نے ایلیٹ کے لفظوں میں دراصل دوسری اور تیسری آواز کی شاعری کی ہے جہاں شاعر نے تاریخ یا روایت سے کردار مستعار لے کر یا تخلیق کر کے ڈرامائی استعجاب پیدا کیا ہے جس کی ایک دو مثالیں اوپر گذر چکیں

چند اشعار اور ملاحظہ ہوں

ے جو موج دریا یہ کہے : سفر سے قائم ہے شان میری
گہر یہ بولا : صدف نشینی ہے مجھ کو سامانِ آبرو کا

ے جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا

ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

جہاں حرکت و عمل، سخت کوشی، ایثار و عشق اور استقامت کی باتیں پیش کرنی ہوتی ہیں تو اسی مناسبت سے انتہائی موزوں اور بر محل رموز و علائم اور اشارے لاتے ہیں تمثیل نگاری اور منظر نگاری کے ذریعہ جس ماحول اور مجموعی فضا کو پیش کرنا چاہا اسے بھرپور طریقے سے پیش کر دیا۔ اس سلسلے میں "محبت"، "حقیقت حسن"، "چاند اور تارے"، "ستارہ"، "دو ستارے"، "شبنم اور ستارے"، "خضر راہ"، "ساقی نامہ"، "ذوق و شوق اور شعاع امید" قابل ذکر نظمیں ہیں۔ اقبال علم موسیقی کے اچھے واقف کار تھے۔ اس لیے ترنم اور آوازوں کی تاثیر اور کلام میں صوتی آہنگ سے مطلوبہ فضا تیار کرنے کے گر سے بھی خوب واقف تھے۔ ذیل کے اشعار میں "س"، "ش"، "ر"، "م" اور "ن" کی آوازوں اور ان کی تکرار سے جو فضا اور موسیقی پیدا کی ہے وہ ظاہر ہو رہا ہے۔

شب سکوت افزا، ہوا آسودہ دریا نرم سیر

تھی نظر حیران کہ یہ دریا ہے یا تصویر آب

اور

خورشید بدامانم، انجم بگریبانم

در من نگری ہیچم، در خود نگری جانم

در شہر و بیابانم در کاخ و شبستانم

من دردم و درمانم من عیش فراوانم

من تیغ جہاں سوزم من چشمۂ حیوانم

اسی طرح تکرار الفاظ، ترک ردیف و قافیہ، مستزاد، مرقع و محل کے اعتبار سے سادہ و ثقیل قوافی کے استعمال اور بحروں کے انتخاب سے بھی انہوں نے اپنا مخصوص آہنگ برقرار رکھا ہے۔ ترنم اور شہزادی کیفیت پیدا کرنے کے لیے انھوں نے بحر متقارب کا کئی جگہ استعمال کیا ہے مگر اس کے علاوہ بحر ہزج، بحر مضارع اور بحر رمل وغیرہ کی مختلف شکلوں سے بھی موضوع نے کلام میں خوبصورت موسیقی پیدا کی ہے۔ علامتوں کے استعمال میں انھوں نے رائج علامتوں میں مسیحائی کے علاوہ مروجہ اور اختراع کردہ رموز و علائم سے بھی خوب کام لیا ہے۔ اسی طرح اقبال نے اپنے اشعار میں سب سے زیادہ نوری پیکروں کو استعمال کیا ہے۔ ان کے علاوہ سمعی اور بصری پیکروں کی بھی کمی نہیں مگر ان تمام پیکروں کی سرشت حرکی ہے۔

ے سورج نے جاتے جاتے شام سیہ قبا کو

طشت افق سے لے کر لالے کے پھول مارے

پہنا دیا شفق نے سونے کا سارا زیور

قدرت نے اپنے گہنے چاندی کے سب اتارے

محمل میں خامشی کے لیلائے ظلمت آئی
چمکے عروس شب کے موتی وہ پیارے پیارے
(لہری، لوچ، نوری)

قلب و نظر کی زندگی دشت میں کوہ کا سماں
چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں
حسن ازل کی ہے نمود چاک ہے پردۂ وجود
دل کے لیے ہزار سود ایک نگاہ کا زیاں
سرخ و کبود بدلیاں چھوڑ گیا سحاب شب
کوہ اضم کو دے گیا رنگ برنگ طیلساں
(لہری، نورہ، لوچ)

وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی | اٹکتی، لچکتی سرکتی ہوئی
اچھلتی، پھسلتی، سنبھلتی ہوئی | بڑا پیچ کھا کر نکلتی ہوئی
(لہری، جری)

رکے جب تو سیل چیر دیتی ہے یہ | پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ

اقبال کے فکر و فن کے ان ممتاز گوشوں کے علاوہ اس کی بھی ضرورت ہے کہ اس زمانہ میں لسانیات، اسلوبیات فن عروض اور صوتیات کی سائنس و تکنیک نے جو غیر معمولی ترقی حاصل کرلی ہے ان کی روشنی میں بھی تفصیلی تجزیاتی مطالعہ کیا جائے۔ اس کے بغیر ان کی شاعری کے حروف و الفاظ اور صوتی آہنگ کی ماہیت پر دو اور دو چار کی طرح فیصلہ کن انداز میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ اس امر کی واقعی ضرورت ہے کہ اقبال کی شاعری میں الفاظ کے دروبست، صوت و لحن، بل، صوت رکن، سُر کی بلندی، گونج، غیر مجہز اور تشدد کرنے والے زور افزائے فقروں کی ترتیب، عروضی تجربوں، ہندی الفاظ اور رنگل اور ماترا ؤں کے طرز استعمال وغیرہ سے بھی تفصیلی بحث کی جائے اور عصری آگہی کے پس منظر میں ان کے جواز اور عدم جواز اور حقیقت و ماہیت کو واضح کردیا جائے۔

ع صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے

انجمن ترقی اردو پاکستان کی شائع کردہ
اردو کی منظوم داستانیں
تحریر :- ڈاکٹر فرمان فتح پوری
قیمت :- پچیس روپے ۲۵

کتابیاتِ اقبالؒ

صابر کلوروی

کتابیاتِ اقبال کے ضمن میں اب تک چند مؤلفین نے اقبالیات کی اس اہم ضرورت کو پورا کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً کوششیں کی ہیں ان میں عبدالغنی، خواجہ نور الٰہی، قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی، ملک نذیر احمد، خواجہ عبدالوحید، ڈاکٹر عبدالحق، پروفیسر اینی میری شمل اور ایس اے واحد کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ کچھ ہی عرصہ قبل مکتبۂ عالیہ لاہور کی طرف سے "دائرۂ معارفِ اقبالؒ" کے تحت علامہ پر شائع ہونے والی کتب کا ایک اشاریہ شائع کیا گیا ہے۔ ان کوششوں کی اہمیت اور قدر و قیمت کے باوصف انہیں اپنے موضوع پر حرفِ آخر نہیں کہا جا سکتا۔ پاکستان میں کتابیات مرتب کرنے کا فن ابھی اتنی ترقی نہیں کر سکا اس لیے مذکورہ بالا مصنفین سے کئی فروگذاشتیں سرزد ہوئی ہیں۔ اقبالیات کے موضوع کی وسعت بھی ایک لحاظ سے مولفین کے لیے دشواریوں کا باعث بنی۔ پھر نقل در نقل نے بھی کئی اعجاز دکھائے۔ اشاریہ سازی کی مختلف جہتوں کے متعلق بنیادی معلومات کی کمی سے ان کتابیات کی افادیت اپنا رنگ نہ جما سکی۔ اقبالیات کے ذخیرہ میں جس تیزی کے ساتھ اضافہ ہو رہا تھا وہ اس امر کا متقاضی تھا کہ کوئی ہمت آشنا ایک جامع اور مستند کتابیات مرتب کرنے کا چیلنج قبول کرتا۔ ایسے میں اس کٹھن اور صبر آزما کام کی تکمیل کا سہرا رفیع الدین ہاشمی صاحب کے سر بندھا۔

ہاشمی صاحب نے اخبارات اور رسائل میں اقبالیات کے ضمن میں شائع ہونے والے مضامین کو ایک الگ کتابیات کے لیے اٹھا رکھا: اس سے انہیں دوسرے مؤلفین کی نسبت ایک سہولت میسر آگئی کہ ان کا کام بڑے دائرے کے اندر ہی نسبتاً چھوٹے دائرے میں سمٹ گیا پھر بھی ہاشمی صاحب کے سامنے اردو اور دوسری زبانوں میں اقبال پر شائع ہونے والی ۸۳۸[1] کتب، رسائل اور غیر مطبوعہ مقالات تھے۔ جن کی ضخامت، سنِ اشاعت، ایڈیشنوں کے متعلق معلومات اور مندرجات کی تفصیل بھی درج کرنا تھی اس ضمن میں ۱۵۲ مصنفین کے ۲۵۳۷ حوالے تھے۔ جنہیں ایک اشاریئے میں منضبط کرنا تھا۔ اور پھر مختلف موضوعات پر حوالوں کو ایک الگ اشاریے میں جمع کرنا تھا۔ صحت اور استناد کے تمام تر امکانات کو بروئے کار لا کر بالآخر ہاشمی صاحب جامع اور افادیت کے اعتبار سے ایک نہایت عمدہ کتابیات تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ پیشِ نظر کتابیات میں اس موضوع پر کام کرنے والے دوسرے مولفین کی اغلاط کی بھی اصلاح کی گئی اور اسے زیادہ سے زیادہ مفید اور بامقصد بنانے میں کوئی کسر

---

[1] ۴۳ زیرِ طبع کتب اور متعدد رسائل کے اقبال نمبروں کے اندراجات اس کے علاوہ ہیں۔

اٹھا نہیں رکھی گئی۔ علامہ کی شاعری اور نثر کے مختلف مجموعوں کی سنِ اشاعت کے تعین میں نہایت دقتِ نظری سے کام لیا گیا۔

کتابیاتِ اقبال کا ایک نمایاں اور انفرادی وصف اس کی جامعیت ہے۔ صرف کتابوں کے ناموں پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ ان کے مندرجات کو بھی بتمام و بہ کمال درج کیا گیا ہے اِس سے قاری کو کتاب کی اہمیت اور افادیت کا فوراً اندازہ ہو جاتا ہے جس سے اقبالیات پر تحقیق کرنے والوں کے لیے دشواریاں کم تر ہو گئی ہیں: اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ گفتارِ اقبال مرتبہ رفیق افضل کے ۱۷۱ مندرجات کو ۹ صفحات دیے گئے ہیں۔ اور شاملو کی SPEACHES & STATEMENT OF IQBAL کے لیے ۸ صفحات وقف کیے گئے ہیں۔

کتابیات کے مندرجات کو چھ حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں اقبال کی نثر اور شاعری کی کتب کا ذکر کیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں اقبال کی کتب سے کشمیری۔ پشتو۔ پنجابی۔ اردو۔ فارسی۔ سندھی۔ گجراتی۔ انگریزی۔ روسی۔ فرانسیسی۔ انڈونیشی۔ سویڈش۔ چینی۔ عربی چیک۔ جرمن۔ ترکی۔ بنگالی اور اطالوی تراجم کا ذکر کیا گیا ہے۔ تیسرے حصے میں کلام اقبال کی شرحوں کا ذکر ہے۔ کتاب کا چوتھا حصہ نہایت اہم ہے۔ اس میں دنیا کی مختلف زبانوں میں اقبال کے فکر و فلسفہ اور حیات پر لکھی جانے والی کتب کی تفصیلات درج ہیں۔ پانچویں حصے میں اقبال پر رسائل کے نمبروں کی تفصیل ہے۔ (ان میں اخبارات کے اقبال نمبر شامل نہیں ہیں) آخری حصے میں منشی فاضل۔ ایم اے۔ ایم ایڈ اور پی۔ ایچ ڈی کے لیے لکھے جانے والے مقالات (اکثر غیر مطبوعہ) کی وضاحتی فہرست درج ہے۔ ہر کتاب کے سلسلے میں مصنف کا نام کتاب کا عنوان۔ ناشر کا نام۔ سنِ اشاعت۔ ضخامت اور کتاب کے مندرجات کا ذکر کیا گیا ہے۔

کتابیاتِ اقبال کا دوسرا نمایاں وصف اس کے تین اشاریے ہیں جو کتاب کے آخر میں شامل کیے گئے ہیں۔ ان میں اشاریۂ مصنفین۔ اشاریۂ کتب اور اشاریۂ موضوعات شامل ہیں۔ جن میں مجموعی طور پر تقریباً ساڑھے پانچ ہزار حوالوں کو الفبائی ترتیب میں سمو دیا گیا ہے۔ ہندسوں اور اسما کے اس گورکھ دھندے میں صحت کا اعلیٰ معیار قائم کرنا کتنا مشکل کام ہے۔ اس کا اندازہ صرف اسی شخص کو ہو سکتا ہے جس نے یہ کام خود سر انجام دیا ہو: اشاریے کی پروف ریڈنگ جان جوکھوں کا کام ہے کیونکہ پروف ریڈر ہندسوں اور حروف سے سرسری نہیں گزرتا بلکہ اسے بسا اوقات اصل مسودہ بھی پلٹنا پڑتا ہے۔ مزید برآں یہ کام اتنا خشک ہوتا ہے کہ پتہ پانی ہو جاتا ہے۔ ان مشکلات کے باوجود اشاریے میں کمال درجہ کی صحت کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اور ظاہر ہے یہ کام خونِ جگر صرف کیے بغیر ناممکن ہے۔

اشاریۂ مصنفین میں مولفِ کتاب نے کتابیات کے مسلّمہ اصولوں سے انحراف کرتے ہوئے ایک جدّت پیدا کی ہے اور وہ یہ کہ ناموں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے نہیں لکھا: بلکہ عام طور پر نام جس طرح لکھا جاتا ہے اُسی طرح درج کیا ہے البتہ سید۔ ڈاکٹر۔ شیخ۔ حکیم۔ مولانا۔ مولوی۔ پروفیسر۔ قاضی۔ نواب بہادر۔ آلنہ۔ جسٹس۔ رانا۔ میاں۔ بیگم۔ سردار۔ آغا۔ مہاراجہ۔ صاحبزادہ۔ سر۔ خواجہ اور چودھری جیسے القابات کو نام کے آخر میں لکھ کر کئی الجھنوں کو کم کر دیا ہے۔ اس ضمن میں مولف کے ایک انداز فکر سے ہمیں کلی طور پر اتفاق ہے اور وہ یہ کہ نام کے الفاظ میں لفظ "محمد" کو انھوں نے نام کا ہی ایک جزو قرار دیا ہے اور اسے

القابات کی طرح (جیساکہ اشاریہ ساز عام طور پر کرتے ہیں) نام کے آخر میں نہیں لکھا۔ یہ مصنف کی رسول پاکؐ سے جذباتی وابستگی کا مظہر ہے جسے اقبال کے عشقِ رسالت مآب کا پرتو بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔

کتاب کی تیسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ اسے ممکن حد تک اپ ٹو ڈیٹ بنایا گیا ہے جب یہ کتابیات میرے ہاتھ میں پہنچی تو مجھے یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ اس میں کچھ ایسی کتب اور رسائل کے مندرجات کا ذکر بھی تھا جو ابھی مارکیٹ میں نہیں پہنچی تھیں ظاہر ہے یہ علمِ نجوم کی بدولت نہیں بلکہ مصنف کی اپنے موضوع سے جذباتی وابستگی اور اقبالیاتی سرگرمیوں پر گہری نظر کے طفیل ممکن ہو سکا۔ کتاب کی طباعت کے دوران جو نئی کتابیں شائع ہوئیں انہیں کتابیات کے آخر میں ضمیمے میں پیش کر دیا گیا ہے کتابیات میں مندرجہ کتب کے ضمن میں اگر کوئی نئی بات معلوم ہوئی ہے تو اسے ایک الگ ضمیمہ میں پیش کر دیا گیا ہے۔ جو اس وقت طباعت کے مختلف مراحل میں تھیں اور اب (سوائے تین چار کتب کے شائع ہو کر مارکیٹ میں آچکی ہیں)

کتابیات اقبال کو مستند ترین کتابیات بنانے کی کوشش میں آخر میں ایک اغلاط نامہ شامل کیا گیا ہے جس میں تینتیس اغلاط کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ٹائپ کی طباعت اور ہندسوں کے گورکھ دھندوں کے پیش منظر اغلاط کی یہ تعداد نہایت کم ہے اس سے محققین کئی نئی الجھنوں سے بچ گئے ہیں۔

کتابیات اقبال میں اپنے پیشرو مولفین کی کتب کی نسبت زیادہ کتابوں کے حوالے موجود ہیں۔ مولف نے اقبال اکیڈمی، پنجاب یونیورسٹی لائبریری، دیال سنگھ کالج لائبریری اور پنجاب پبلک لائبریری سے بھرپور استفادہ کیا اور ایک ایک کتاب کو خود دیکھا اور نوٹس لیے اس کے علاوہ میری ذاتی معلومات کے مطابق مولف نے پاکستان کے اکثر بڑے بڑے شہروں کی لائبریریوں اور اہل علم سے مسلسل رابطہ قائم رکھا اور کتابیات میں مشمولہ کتب کے ضمن میں تمام تر تفصیلات فراہم کرنے اور نئی کتب کے متعلق معلومات جمع کرنے میں بڑی تگ و دو کی۔

ظاہر ہے اتنے بڑے کام کو اتنے قلیل وقت میں اور اتنی صحت اور سلیقے سے مرتب کرنا کسی انسان کے بس کا کام نہیں تھا قدیم اسلوب بیان میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ یہ کسی پڑھے لکھے جن یا دیو کا کام ہو سکتا تھا یا جدید اسلوب بیان میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ کمپیوٹر کے بغیر یہ کام ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا رفیع الدین ہاشمی صاحب نے بھرپور محنت لگن اور شوق کے طفیل اس مشکل کو گویا پایۂ تکمیل تک پہنچا کر ہی دم لیا۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے اقبالیات کے موضوع میں بڑی وسعت ہے بیرونی ممالک بالخصوص ہندوستان میں اقبال پر بہت کام ہوا ہے۔ لیکن وسائل اور رابطے کی کمی کے طفیل بیرونی ذرائع سے تشفی بخش حد تک استفادہ کرنا فی الحال مشکل ہے حتیٰ کہ پاکستان میں اقبال پر چھپنے والی تمام کتب کی فراہمی کا دعویٰ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کتابیاتِ اقبال میں نت نئے اضافے ہوتے رہیں گے اس لیے یہ اب اقبالیات سے دلچسپی رکھنے والوں کا فرض ہے کہ اس کتابیات کو خوب سے خوب تر بنانے میں مولف کے ساتھ تعاون کریں: اسی جذبے کے زیر اثر کتابیاتِ اقبال کی چند فروگذاشتوں اور کوتاہیوں کی طرف اشارہ کرنا مناسب ہوگا۔

کتابیات اقبال میں دو کتابوں کا ذکر نہیں کیا گیا ہے: پہلی کتاب کا نام "شاعرِ مشرق" ہے ۲۶ صفحات کی اس کتاب کے

مصنف مولانا سعید الدین شیرکوٹی ہیں اور اسے کتب خانہ انصاریہ قصہ خوانی بازار پشاور نے شائع کیا تھا۔ کتاب کی سن اشاعت کا ذکر نہیں کیا گیا۔ لیکن دیباچے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی۔ کتاب کے مندرجات کی تفصیل یوں ہے۔

حالات زندگی۔ تصنیفات اقبال پر ایک نظر، کلام و پیام اقبال۔ دو تنقیدی زاویے اقبال کا طرز بیان اور طریقۂ اظہار۔ کلام اقبال کی معنوی خوبیاں۔ فلسفۂ عشق و عقل۔ تصوف اور اقبال۔ مصور فطرت اقبال خودی اور اقبال۔ ملت اور اقبال۔ تسخیر فطرت۔ اقبال کا تدریجی ارتقا۔

دوسری کتاب شیر محمد مینوش کا ترجمہ ضرب کلیم (پشتو) ہے جسے یونیورسٹی بک ایجنسی پشاور نے شائع کیا ہے۔ صفحات کی تعداد ۱۹۵ ہے لیکن سن اشاعت کی یہاں بھی صراحت نہیں کی گئی۔ یہ ترجمہ سید تقویم الحق کاکا خیل کا ہے۔ ترجمہ ضرب کلیم کے علاوہ ہے۔

کتابیات اقبال میں اردو کے علاوہ جن زبانوں کے ذخیرہ کتب اقبالیات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے اُسے مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ ابھی اس ضمن میں مزید تحقیق اور چھان بین کی ضرورت ہے۔ مثلاً گجراتی زبان میں پیام مشرق اور زبور عجم کے گجراتی ترجموں کے علاوہ بھی اقبالیات سے تعلق رکھنے والی چند کتب پشاور یونیورسٹی کی جنرل لائبریری کے اورینٹیل سیکشن میں دیکھنے میں آئی ہیں۔

ایک ثانوی شہادت عبدالوہاب عزام کی عربی زبان میں اسرار و رموز۔ پیام مشرق اور ضرب کلیم [ص ۳۷] کے علاوہ بھی بال جبریل کے عربی زبان میں ترجمہ کیے جانے کے متعلق ملتی ہے علاوہ ازیں محمد تقی مقتدری سید کی کتاب "اقبال متفکر و شاعر اسلام" میں دو کتابوں کے اشتہار موجود ہیں جن کے نام ہیں "روشن تصوف اقبال اور اتفاق مسلمانان از نظر علامہ اقبال" اگرچہ مصنف یا مولف کی صراحت یہاں بھی موجود نہیں ہے۔

اب ان کتابوں و پمفلٹوں کا ذکر جو علامہ کے خطبات اور منتخب نظموں کے متعلق مختلف اداروں کی طرف سے شائع ہوتے رہے کتابیات اقبال میں ایسے چند حوالے درج ذیل معلومات کو بھی کتابیات اقبال میں شامل کیا جا سکتا تھا۔

شمع اور شاعر	نولکشور پریس	صفحات ۱۶	سن اشاعت ندارد
شکوہ	درویش پریس	" ۳۲	" " "
شکوہ	راجپوت پریس	" ۱۶	" " "
تصویر درد	"	" ۲۴	" " "
مکمل ترانہ	کپور آرٹ پریس لاہور	" ۱۶	" " "

؎ ملاحظہ ہو فہرست ذخیرہ کتب میر ولی اللہ ایبٹ آبادی پشاور یونیورسٹی جنرل لائبریری

شمع اور شاعر
شکریہ یورپ
پکر اقبال [؟]
} شائع کردہ مرغوب ایجنسی [1]

نالۂ یتیم : شکوہ : شمع و شاعر
جواب شکوہ : فریادِ ملت
قومی زندگی از ڈاکٹر اقبال ۔ مکمل ترانہ
بلال جشنامہ ۔ اقبال اکبری ۔ خضرِ راہ
} شائع کردہ شیخ جان محمد اللہ بخش تاجران کتب بنگلہ ایوب شاہ : لاہور [2]

ان کتب کے علاوہ دو رسالوں کے نمبروں کا تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ان میں الحمرا (۱۹۵۲) (ایڈیٹر حامد علی خان) اور رسالہ اباسین (پشتو) کا اقبال نمبر شامل ہے۔ آخر الذکر رسالے کا نمبر ۱۹۶۷ء میں ادارہ مطبوعات پاکستان کراچی کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ اس ادارے کے مدیر منتظم تھے پیر محمد شارق اور غلام سرور۔ مذکورہ اقبال نمبر میں اجملہ شیرہ بنلور نصیر احمد رند کے مضامین شامل ہیں۔

رسائل کے بعد دو کتابوں کے نئے ایڈیشنوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جن کے بارے میں کتابیاتِ اقبال "خاموش ہے۔ پہلی کتاب "علامہ اقبال حالات و خیالات" از عبدالرحمن بے تاب [کتابیات ص ۱۸۸] ہے۔ جس کا دوسرا ایڈیشن جنوری ۶۷ء میں شجاعت پبلیکیشنز نوشہرہ سٹی نے شائع کیا: دوسری خطاب بہ اقبال [کتابیات ص ۱۱۵] کا دوسرا ایڈیشن ہے جسے بیشریک ڈپو کمالیہ (منٹگمری) نے شائع کیا۔

کتابیات اقبال کی کوتاہیوں کے اس جائزے میں اب چند ایسی خامیوں کا تذکرہ جنھیں بہرحال کتابیات کے دوسرے ایڈیشن میں درست کر لینا چاہیے پہلی کوتاہی خیابان کے اقبال نمبر (۱۹۶۳ء) کے ایک اندراج کے متعلق ہے اس اقبال نمبر سے بیشتر مضامین بارہ نئے مضامین کے اضافے کے ساتھ خیابان اقبال کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیے گئے نمبر میں افضل حسین اظہر کا مضمون "کلام اقبال کے فنی پہلو" خیابان اقبال میں شامل نہیں کیا گیا تھا بلکہ اسی کی جگہ اسی مصنف کا دوسرا مضمون "کلام اقبال کے متضاد پہلو" شائع ہوا اس کی صراحت کتابیات اقبال [ص ۲۱۰] میں موجود نہیں ہے مولفاً گو مضامین کے ملتے جلتے ناموں میں تسامح ہوا ہے۔

---

[1] دیکھیے "خلافت اسلامیہ" (۱۹۲۳) شائع کردہ ظفر برادرس لاہور: کتابیات اقبال میں ادارہ مذکور کی ایک کتاب "دردِ دل" کو شامل کیا گیا ہے۔

[2] کتابیات میں اس ادارے کی درج ذیل کتب کا حوالہ ہی دیا گیا ہے: شکوہ ۔ جواب شکوہ ۔ نالۂ یتیم

[3] بحوالہ ہمایوں ۔ اپریل ۵۳ء

"کتابیاتِ اقبال" کی اِن فروگذاشتوں کے بعد کتابت کی چند غلطیوں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جنہیں اغلاط نامہ میں جگہ نہیں ملی۔

اشاریے میں :-

(ا) ص ۲۸۳ پر ضیاالدین برنی کی ذیل میں ص ۲۱۷ کا حوالہ موجود ہے لیکن اس صفحہ پر برنی کا کہیں ذکر نہیں

(ب) ص ۲۸۸ پر عبدالوہاب عزام کی ذیل میں ص ۲۴۴ نہیں بلکہ یہ صفحہ ۲۲۴ ہے۔

(ج) ص ۲۹۱ پر پروفیسر کرم حیدری کی ذیل میں ص ۲۱ کا حوالہ درج ہے۔ حالانکہ اس صفحہ پر پروفیسر موصوف کا کہیں ذکر نہیں ہوا۔

(د) ص ۲۹۹ پر ممتاز حسین کی ذیل میں ص ۱۵۷ کا حوالہ بھی غلط ہے۔

(ہ) اوراق گم گشتہ کا ذکر ص ۴۲ پر موجود ہے جبکہ اشاریے میں ص ۳۱۱ پر مذکورہ کتاب کے تحت اس صفحہ کا حوالہ درج نہیں ہے۔

کتابیات کے متن میں کتابت کی یہ دو غلطیاں معلوم ہوئی ہیں۔

(i) ص ۱۶: سطر ۱۲ میں لفظ "ہیں" کی جگہ "نہیں" چاہیے۔

(ii) ص ۴۶ پر آئینہ عجم کے تحت لفظ "طباطے" ہونا چاہیے۔

کتابیات اقبال کی اشاعت کے بعد میرے علم کی حد تک رسائل کے اقبال نمبروں اور کتب کی تعداد میں مزید ڈیڑھ دو سو کا اضافہ ہوا ہے لہذا یہ اقبال اکیڈمی کا فرض ہے کہ وہ "کتابیات اقبال" کو اپ ٹو ڈیٹ بنانے کے لیے ایک نیا ایڈیشن چھاپے لیکن جیسا کہ اکیڈمی کی دیگر مطبوعات کا حال ہے کتابیات کا پہلا ایڈیشن بھی اب تک فروخت نہیں ہو سکا ہوگا۔ اس صورت میں اکیڈمی کو چاہیے کہ وہ سال بہ سال کتابیات اقبال کا ضمیمہ شائع کرے تاکہ جس جذبے کے زیر اثر یہ کتابیات مرتب کی گئی ہے اس کی پذیرائی ہوتی رہے: اس ضمن میں ایک اور بے حد ضروری قدم یہ اٹھانا چاہیے کہ کتابیات اقبال کے حصہ دوم کے طور پر ایک ایسی ہی کتابیات مرتب کرنے کا کام شروع کر دینا چاہیے جس میں اخبارات کے اقبال نمبروں کے مندرجات کی تفصیل اور اخبارات رسائل اور کتب میں اقبال کے متعلق مضامین کی وضاحتی فہرست درج ہو: اگرچہ یہ کام کتابیات اقبال حصہ اول نسبت خاصا مشکل ہے تاہم اگر مناسب سہولتیں مہیا کی جائیں تو پروفیسر رفیع الدین ہاشمی صاحب جیسے محنتی آدمی کے لیے اسے بطریق احسن سرانجام دینا چنداں مشکل بھی نہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ اخبارات و رسائل میں اقبالیات کا بیش بہا مواد دبا پڑا ہے۔ اور یہ عام طور پر اقبال پر تحقیق کرنے والوں کی دسترس سے باہر ہے۔ اقبال اکیڈمی کو رطب و یابس قبول کرنے اور اس کی اشاعت پر سرمایہ ضائع کرنے کے بجائے اقبالیات سے متعلق اس ذخیرہ کو مختلف جلدوں میں شائع کرنا چاہیے تاکہ اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کیا جا سکے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس ذخیرے کی بازیابی کے بغیر علامہ کی جو بھی سوانح عمری لکھی جائے گی وہ نامکمل رہے گی۔ ہمارے علم کی حد تک اقبال اکیڈمی کی لائبریری میں ایسا بیش بہا مواد موجود ہے۔

اقبال اور پیغامِ انسانیت

نظیر حسنین زیدی

اقبال شاعر بھی ہے اور مفکر بھی، حکیم بھی ہے اور خودی کا پیغام بر بھی، وہ تہذیب و تمدن کا نقاد بھی ہے اور محی الملت والدین بھی، اُن کے افکار و تاثرات کا تجزیہ آسان نہ ہوتا اگر صرف اردو شاعری اُن کے اظہار کا ذریعہ ہوتی۔ آفاقی حیثیت سے بہر حال اردو کی وسعت عالمگیر نہ تھی۔ اس لیے انھوں نے فارسی شاعری کو ذریعۂ اظہار بنایا اور اسرارِ خودی و رموزِ بے خودی کے ذریعہ ایک مربوط نظریۂ حیات پیش کیا۔ یا اُس نظریۂ حیات کے عوامل بتائے۔ اُن کی اردو شاعری میں اس طرح مربوط اور مسلسل نظریۂ حیات کی تشریح مشکل سے ملے گی۔ اسی لیے میرے خیال میں فلسفۂ اقبال کی تشریح کے سلسلے میں اس کتاب کو بنیادی حیثیت دینی چاہیے بلاشبہ شاعر کو اپنے اظہارِ خیال کے لیے پابند نہیں کیا جا سکتا، اس لیے کہ بقول غالب "فریاد کی کوئی لے نہیں ہے، اور نالہ پابندِ نے نہیں ہے"۔ اور کسی بھی شاعر کی شاعری منطق کی پابند نہیں ہوتی۔ نیز یہ کہ شاعر کا کام استدلالی حیثیت سے کسی نظامِ فلسفہ کو پیش کرنا نہیں ہوتا۔ اور شعر جیسی وجدانی چیز منطقی تجزیہ کی متحمل نہیں ہوتی، شعر کا منطقی تجزیہ ایسا ہی ہے جیسے پھول توڑ کر اُس کی پر پتی علیحدہ علیحدہ کر کے خوردبین سے اُس کی نزاکت کی باریکی تلاش کی جائے۔

شاعر نے فارسی شاعری میں جس مربوط نظامِ حیات کی تشریح کی ہے اُس کے مختلف گوشوں پر اردو شاعری میں روشنی ڈالی اور ان مختلف گوشوں کو نئے عنوانات کا نام دیا۔ بہر حال اقبال کے کلام میں جو مرکزی خیال فارسی اور اردو شاعری کے گرد گھومتا ہے، وہ ابنِ آدم کے لیے تہذیبِ نفس کا پیغام ہے اور تہذیبِ نفس کے لیے ہی مسلسل سعی، منزلِ انسانیت کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ابنِ آدم اپنے مادی اور حیوانی تقاضوں کے سبب اپنے ماحول سے دست و گریباں ہوتا ہے۔ گرد و پیش کی اشیاء کے ماحول، اور حوادث کو سمجھنا اس کے لیے تنازع البقاء میں ناگزیر ہوتا ہے اور جب اسے فرصت نہیں ملتی، تو وہ اپنی ماہیت کے متعلق کیا سوچے، پھر یہ کہ اس کو زندگی پیکرِ اضداد نظر آتی ہے۔ لہٰذا اس کشمکشِ ازلی کو سمجھنے کے لیے خود اس نے فطرت کی قوتوں کو اپنے اوپر قیاس کر لیا۔ خواہشوں کے دیوتا بنائے اور اپنے تصورات کو مشخص کر کے اور لاانتہائی قوتوں کا حامل سمجھ کر اُن سے مرعوب ہو گیا۔ اس طرح وہ فقط حیوانی جبلتوں کا غلام بن کر رہ گیا۔ اسی لیے یہ آدمی انسان نہ بن سکا۔ بلکہ ہمارے روزمرہ کے مطابق آدمی بھی نہ بن سکا۔ چہ جائیکہ انسان، قرآن مجید نے اسی لیے اس کی حیوانی جبلت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اولٰئک کالانعام بل ھم اضل (یہ سب چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ گمراہ ہیں)۔

اقبال نے اس سلسلۂ خیال کو مولانا روم کے نقطۂ نظر تک پہنچایا: اور "اسرارِ خودی" کے شروع میں مولانا روم کے اشعار

کو بطور خاص لکھا۔ اِن اشعار کا انتخاب اِس امر کی طرف غمازی کرتا ہے کہ استاد و شاگرد معنوی دونوں ایک ہی محور کی طرف رواں دواں ہیں ــــــ یہی تلاشِ انسانیت، مولانا رومی نے جس بلیغ انداز میں یہ قطعہ کہا۔ اقبال کی پوری شاعری کا بھی نقطۂ نظر ہے ذیل میں یہ اشعار درج ہیں ؎

دی شیخ باچراغ گشت گرد شہر — کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
زین ہمرہان سست عناصر دلم گرفت — شیر خدا و رستم دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما — گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

اقبال نے بھی اپنی شاعری میں تلاشِ انسانیت کو اپنا نقطۂ فکر قرار دیا۔ انھوں نے مغربی تہذیب کی تباہ کاریوں کو دیکھا اور فلسفیانہ انداز میں سوچتے ہوئے اُسی تہذیب کے فروغ کو اپنا مشن قرار دیا جس کا نام اسلام ہے، انھوں نے بجا طور پر اسلام کی عمارت میں جہاں جہاں گھن لگ چکا ہے اُس کی بھی نشان دہی کی، اِسی لیے انھوں نے نقاد کا فریضہ انجام دیتے ہوئے بلا کم و کاست اسلام کے زوال کے وجوہات اس قدر جامع و بلیغ انداز میں پیش کئے جس کا جواب نہیں ہے آپ فرماتے ہیں ؎

چوں خلافت رشتہ از قرآں گسیخت — حریت را زہر کام اندر ریخت

اقبال کے اعلانِ حق نے جو حقیقت بیان کردی ہے، اس کو کوئی بھی تاریخی حقائق کے پیشِ نظر جھٹلا نہ سکا۔ گویا اقبال کی نظر میں مادّی کارنامے۔ فتوحاتِ ارضی، کوئی اہمیت اس لیے نہیں رکھتے کہ اسلام کا نام لے کر فتوحاتِ ارضی کرنے سے روحِ اسلام کچل ڈالی گئی اور پھر لطف یہ کہ ہر بادشاہ کو ظل اللہ کہا گیا۔ اور بادشاہوں کے اعمال و افکار کو تقدیرِ الٰہی سے وابستہ کردیا گیا۔ جس کے نتیجہ میں ایک ایسا گروہ بظاہر ترکِ دنیا کرکے درویشوں کی شکل میں نمودار ہوگیا۔ جو صوفی بن گیا۔ ورنہ خود مختار بادشاہوں نے اسلام کا نام لے کر جو کچھ کیا اس کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ سلطان نظام الدین اولیا جیسے صالح انسان کو جب شہر سے چلے جانے کا حکم دیدیا۔ اور وہ خود سفر پر روانہ ہوگیا اور اسی کی واپسی کے وقت ایک سلطان بادشاہ کے ظلم و تشدد کے باعث کہنا پڑا۔ ؎

ہنوز دلی دور است

سلطان نظام الدین اولیا تو دلی ہی میں رہے لیکن اُسے دلی آنا نصیب نہ ہوا۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہر زمانے کے صلحاء اور حکماء نے اپنے دور میں ایسے انسانوں کے متعلق کیوں خراب رائے رکھتے تھے۔ اس کا جواب یہی دیا جاسکتا ہے کہ یہ منتخب روزگار افراد مادی وسائل سے فتوحات کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے تھے۔ وہ تو آدمیوں کو انسانیت کی میزان پر تولتے تھے۔ (اور صاحبانِ اقتدار، ہوس پرست انسان، بادشاہوں کے خوشامدی اس معیار پر کہاں پورے اتر سکتے تھے۔

اسی لیے صاحبانِ صفا اس ظاہری لباس، تمکنت اور شان و شوکت سے مرعوب نہیں ہوتے۔ ان کے یہاں چلہ کشی۔ مراقبے اسی نفس کی انا کو ختم کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ نماز کا بھی مقصد انسان کا خالق کے سامنے سر جھکا کر اس کی انانیت

کو ختم کرنا ہے۔

مشہور ادیب ڈاکٹر جانسن نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ میری رائے انسانوں کے متعلق بہت خراب ہے، جب اُس سے پوچھا گیا کیوں؟ تو اس نے جواب دیا کہ "جب لوگ مجھے بہت اچھا سمجھتے ہیں، حالانکہ میں خود اپنے متعلق جانتا ہوں کہ میں کتنا ذلیل ہوں۔ تو ایسے ذلیل آدمیوں کو اچھا سمجھنے والوں کی اپنی کیا حالت ہوگی، کہ وہ مجھ سے بدتر ہی ہونگے"۔

اقبال کو اپنے پیر و مرشد رومی کی طرح انسان کی تلاش رہی، اور انھوں نے پوری دردمندی سے کہا ؎

نغمہ کجا و من کجا، ساز سخن بہانہ ایست　　سوئے قطار می کشم ناقۂ بے مہار را

یہ ناقۂ بے مہار وہ انسان نما آدمی ہے جو سیدھی راہوں سے بھٹکا ہوا ہے۔ جو اقبال کی تعلیم اس کے اثرات سے بلکہ قرآن مجید کی تعلیم کے بالکل برخلاف مادیت کے جال میں پھنس چکا ہے۔ فروغِ دولت کے چکر میں افزونی دولت کو معیار کامیابی سمجھتا ہے۔ اقبال نے بات وہیں سے شروع کی، جہاں سے یونانی فلسفہ کے اثرات ترجمہ ہوکر عربوں میں عام ہوئے اور انھوں نے اس فلسفہ کے اثرات سے متاثر ہونا شروع کیا، یہ نقطۂ نظر افلاطونی فلسفہ کے نام سے شروع ہوا۔ اس فلسفہ نے مغرب پر بھی اثر ڈالے اور مشرق پر بھی اسی فلسفہ نے محسوس کو محسوس کے مقابل میں بے حقیقت قرار دے کر انسان کو عالم رنگ و بو سے بے تعلق کر دیا۔

اور جس کے سبب جہاد زندگی سے گریز پائی کو تقویت ملی، اور پھر رہبانیت ہی حاصل زندگی قرار پائی، نفسِ امارہ کو مارنے کے لیے ترک دنیا کا اصول وضع کیا گیا۔ حالانکہ اسلام نے واضح طور پر اعلان کیا تھا۔ لیس منا من ترک الدنیا لِلآخرۃ، و من ترک الاٰخرۃ للدنیا۔ (وہ ہم میں سے نہیں ہے جس نے دنیا کو آخرت کے لیے ترک کر دیا، اور آخرت کو دنیا کے لیے) اقبال نے اسی افلاطونی فلسفہ کے خلاف آواز بلند کی اور کہا ؎

بر تخیل ہائے ما فرماں رواست　　جام او خوب آور گیتی رُباست

اور اپنے غم کی کیفیت میں اس امر کا بھی اظہار کر دیا ؎ گوسفندے در لباسِ آدم ست، اسی لیے انھوں نے مشرق کی جھوٹی روحانیت کے لباس کو جو تصوف کے لبادے میں لپٹی ہوئی تھی، اپنے افکار سے تار تار کر دیا۔ اور بالاعلان کہا ؎

یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے　　گلیم بوذر و دلق اویس و چادر زہرا

اس یونانی فلسفہ کے اثرات کے تحت غیر اسلامی تصوف سے دو نقصان پہنچے، ایک دنیا کی ذمہ داریوں سے علیحدگی، دوسرے شریعت کے احکام سے دوری، اور طریقت کو شریعت کے مقابلے میں رکھا گیا اور شریعت کو پوست بے مغز قرار دیا گیا۔ اس طرح اصولی زندگی کا مذاق اڑایا گیا۔ دور اول میں امام جعفر صادقؓ نے ایک تارکِ دنیا کو تصوف کا لبادہ پہنے ہوئے دیکھ کر اس پر تنقید کی تھی۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے نفسِ انسانی کے سلسلہ میں اپنے چوتھے خطبہ میں واضح طور سے فرمایا کہ "مسلمان متکلمین نے بھی نفس انسانی کی استواری اور خود اختیاری کی طرف توجہ نہیں کی، متکلمین نے روح کو بھی مادے کی لطیف قسم بنا دیا۔ جو جوہر نہیں ہے عرض ہے، اور یہ کہ روح مادہ کے ساتھ فنا ہو جاتی ہے۔ پھر یوم حشر میں اس کو دوبارہ پیدا کیا جائیگا۔ اس غیر اسلامی

تصور کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ مغربی ایشیا کے جن ممالک میں اسلام پھیلا، وہاں یونانی فلسفہ کا اثر فضا میں پھیلا ہوا تھا یا نظریۂ عیسائی، زرتشتی تصورات تھے، ان خطوں میں جہاں لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ وہ اُنہی قبل اسلامی تصورات میں اسلامی عقائد کو ڈھالنے لگے، وہ ماہیت وجود کو سمجھنے کے لیے قرآنی ہدایت "فی انفسکم افلا تبصرون کو بھول گئے"۔ (قرآن کہتا ہے کہ جس خدا نے تمہیں لم یکن شیئاً مذکوراً سے لے کر احسن تقویم تک پہنچایا۔ کیا وہ اب تم کو ردی مال سمجھ کر چھوڑ دے گا۔) اسی لیے اقبال کے خیال میں "خودی کا ارتقاء بقا کا ضامن ہے۔ مبارک ہیں وہ جنہوں نے اپنے نفس کا صالح بنایا قد افلح من زکھا۔ اور موت اس امر کا امتحان ہے کہ کس انسان نے اپنی ذات (خودی) کے ساتھ کیا کیا"۔ اقبال نے زندگی کو لذت والم کے پیمانوں سے نہیں ناپا۔ پیمانہ فقط یہ ہے کوئی فعلِ خودی اپنے عزتِ نفس کے مدارج کو مضبوط کرتا ہے، یا اُس کو ضعف پہنچاتا ہے۔ (اسی لیے قرآن کا استدلال ہے کہ جو خدا تمہیں عدم سے وجود میں لایا، جس نے ترقی کی منزلیں طے کرائیں کیا وہ عاجز ہے کہ تم کو جوں کا توں نہ کھڑا کر دے، یا ایسی صورت میں لے آئے جس کا تم تصور نہیں کر سکتے۔"

دوسرے خطبہ میں نوعِ انسانی کے لیے تعلیم کے سلسلہ میں تشریح کرتے ہوئے فرمایا "نوع انسان کے دورِ نابالغی میں فطرت نے تعلیم و تلقین کا یہی طریقہ استعمال کیا کہ افکار و اعمال کے معین سانچے ایک شخص کی فطرت میں رکھ دیئے۔ تاکہ دوسروں کے لیے بے چون و چرا اسوہ عمل بن جائے۔ لیکن انسانیت کے بلوغ میں فطرت کا تقاضا یہ تھا کہ انسان مشاہدے، مطالعے اور استقراء سے اپنے ماحول کو تسخیر کرے، اور ماورائے عقلی ذرائع کو اس منزل میں ترک کر دے، اسی لیے آنحضرت صلعم انسانیت کی اس بلند ترین منزل پر فائز ہیں کہ فرمایا گیا "بُعثت لاتمم مکارم الاخلاق۔ گویا مکارم اخلاق کی بلندیوں کے طے کرنے والے کا نام انسان ہے۔ گویا آدمیت کا آغاز نبوت سے ہوا" اور ایسا شخص انسانوں کو انتشار سے نکال کر وحدت پیدا کرتا ہے۔

اب جب انسانیت بلوغت کے درجہ تک پہنچ گئی، تو اب قرآن نے بالتکرار یہ تلقین شروع کی کہ تدبر و تفکر اور مشاہدہ نفس و آفاق سے اپنی زندگی کے لیے ہدایت حاصل کرو اس کے ساتھ تاریخِ انسانی سے سبق لو۔ یہی معنی ختم نبوت کے ہیں کہ کسی فوق الفطرت ذرائع سے ہدایت حاصل کرنے کا ادعا۔ اب تمام قسم کے تجربات انسان عقل و مشاہدہ سے پرکھے، اور نوعِ انسان پر حکمت کے دروازے کھول دے کہ اب فہمِ فطرت اور تسخیرِ فطرت اس کے (انسان کے) ذریعہ سے ہوگی "ھٰذا من عرف نفسہٗ عرف ربہٗ" کے مصداق۔ اپنی نفس کی معرفت اہم ترین فرض ہے۔ اور حضرت علی کے ارشاد کے مطابق "اتزعم انک جرم صغیر وفیک انطوی عالم الاکبر" اے انسان تو یہ گمان کرتا ہے کہ تو ایک معمولی سا ڈھانچہ ہے۔ حالانکہ تجھ میں ایک بڑا علم چھپا ہوا ہے۔" آدمی خود اپنی معرفت اپنے نفس کی حقیقت پر غور کر کے حاصل کر سکتا ہے۔ اسی لیے بصیرتِ نفس رکھنے والے ہی حقیقت میں انسان کہلانے کے مستحق ہیں، کیونکہ خود شناسی خدا شناسی کا ذریعہ ہے۔ اور قرآن معرفتِ نفس کے سلسلہ میں خود کہتا ہے "فی انفسکم افلا تبصرون"۔ جب انسان معرفتِ نفس کے تامل و فکر کرے گا۔ تو انقلابِ لیل و نہار اختلاف السنہ، قوموں کے عروج و زوال پر غور کرنے کے باعث اُسے اندازہ ہوگا کہ افراد و اقوام کس طرح مٹ جاتی ہیں۔ اور اُن کے آثار بھی فنا کر دیتی ہے اس کے برخلاف مظاہرِ فطرت کے سامنے سے آنکھیں بند کرنا، قرآن کے نزدیک قابلِ مذمت ہے۔ اور جو یہاں اندھا ہوگا "فمن کان اعمیٰ فی ھٰذہ الدنیا فھو فی الاخرۃ اعمیٰ" وہ قیامت میں بھی اندھا ہوگا اور ظاہر ہے کہ جس نے قرآن کے ارشاد کے

مطابق افرایت من اتخذ الٰہہ ھواہ" (کیا تم نے دیکھا کہ اس نے اپنی خواہشات کو اپنا خدا بنا لیا ہے) خواہشات کے بت بڑھتے بڑھتے انسان کو اندھا کر دیتے ہیں۔ اور یہی اس کی بے بصیرتی ہے۔ جو اس کو دائرہ آدمیت یا انسانیت سے گرا دیتی ہے اقبال نے انسانی بصیرت خودی کا ایک نصب العین قرار دیا تھا۔ جو اس کو مرد مومن میں نظر آتا ہے۔ اس معیار پر جب وہ ابن آدم کو پرکھتا ہے تو اسے وہ افراد نظر آتے ہیں جن کے متعلق وہ خود خدا سے شکایت کرتا ہے ؎

یہی انسان ہے سلطان بحر و بر کا　　کہوں کیا ماجرا اس بے بصر کا
نہ خود بیں نے خدا بیں نے جہاں بیں　　یہی شاہکار ہے تیرے ہنر کا

اقبال ایک اور خطبہ میں ارشاد فرماتے ہیں "کہ نفس انسانی کو معرفت ذات اس وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ ماضی، حال، مستقبل میں منقسم زمان اور خارجی مکان کے حدود سے نکل کر اپنی ذات کے عرفان میں غوطہ لگاتا ہے۔ (تو اس محدود دنیا سے ماورا ہو کر) تو اسے خدا کی ذات تک (عرفان کے لیے) جو زمان و مکان کی ماورائی ہے ان حدودِ زمان و مکان سے باہر آنا پڑیگا۔ کیونکہ زمان و مکان کا مسئلہ زندگی و موت کا مسئلہ ہے۔ اور محدود دنیا سے نکلے بغیر نہ خدا کا کوئی صحیح تصور قائم ہو سکتا ہے اور نہ نفس انسان کے غیر محدود ممکنات کا۔

"اور وقار نفس پیدا کرنے کے لیے عزت کو انسان کی خودی کا محافظ بنایا"۔ اور غیرت ایک ایسا جذبہ ہے جو انسان کو جہانی قوتوں سے مرعوب نہ ہونے کا حوصلہ پیدا کرتا ہے۔ اس لیے صاحب عزت کے کوئی حادثہ یا مشکل ترین کام عزت نفس کے مقابلہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اور ایسا انسان جب شہادت گہ الفت میں قدم رکھتا ہے تو وہ بالاعلان کہتا ہے عزت کی موت ذلت کی زندگی سے بہتر ہے اسی لیے اقبال نے کہا کہ "خدائے کائنات کے سامنے ایک سجدہ انسان کو ہزار سجدوں سے نجات دلاتا ہے"۔

اور "تخلقوا با اخلاق اللہ" کی تعلیم کے مطابق خدا کے نمود ہونے کی صفت مرد مومن میں پیدا ہو جاتی ہے۔

بہر حال اقبال جب دنیا کے حجم غفیر پر نظر ڈالتے ہیں تو انھیں نتیجہ پر پہنچنا پڑتا ہے کہ ؎

انسان کا کیا قحط ہے اس دیر کہن میں　　اک مرد حق آتا ہے کئی ایک قرن میں
سمجھائے انہیں کون جو بیمار ہست ہیں دھن میں　　دولت جو حقیقی ہے وہ انسان کے من میں

اس دولت سرمد کا شہنشاہ تھا اقبال
فطرت کی گواہی ہے کہ حق آگاہ تھا اقبال

کام ایسا جو کرتا ہے وہ مرتا نہیں ہرگز　　ایسے جو جیے، موت سے ڈرتا نہیں ہرگز
دنیا سے گیا، دل سے گزرتا نہیں ہرگز　　اس صفحہ سے یہ نقش اترتا نہیں ہرگز

جب تک کہ دل افروز یہ پیغام ہے باقی
عالم کے جریدہ پہ ترا نام ہے باقی

مختصر یہ کہ اقبال جہاں کو پیغام دیتے ہوئے کہتے ہیں ؎

تنے پیدا کن از مشتِ غبارے
تنے محکم تراز سنگیں غبارے

علامہ اقبال کی شخصیت اور فن پر لکھی جانے والی پہلی کتاب

اقبال رح

مصنفہ : احمد دین (مصنف "سرگزشت الفاظ)

مرتبہ : مشفق خواجہ

یہ کتاب پہلی بار ۱۹۲۳ء میں طبع ہوئی تھی اور اس ایڈیشن کے تمام نسخے جلا دیئے گئے تھے۔ دوسری مرتبہ یہ کتاب ۱۹۲۶ء میں ترمیموں اور اضافوں کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ نئے ایڈیشن میں متن ۱۹۲۶ء کے ایڈیشن پر مبنی ہے اور ۱۹۲۳ء کے ایڈیشن کے تمام حذف شدہ مباحث اور اختلافات کو کتاب کے آخر میں شامل کر دیا گیا ہے۔

کتاب کے شروع میں مرتب نے طویل مقدمہ لکھا ہے جس میں احمد دین کے حالاتِ زندگی، ادبی کاموں اور علامہ اقبال سے ان کے تعلقات کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔

صفحات : ۵۲۸ قیمت : چالیس روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان

بابائے اردو روڈ۔ کراچی نمبر ۱

اقبال اور پختون

محمد پرویش شاھین سوات

دنیا کے اکثر ممالک خاص کر دانشوروں نے پختون کو اچھی طرح سمجھا ہے اس کی خو بو، شجاعت، مہمان نوازی، وطن دوستی، جذبۂ جہاد اور اسلام دوستی سے اچھی طرح آگاہ ہیں لیکن شومئ قسمت سے پختونوں کے ساتھ جس کسی کا بھی کوئی واسطہ رہا ہے۔ انہوں نے ان کی کردار کشی کی ہے اور اُن کو مٹانے اور اُن کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کی پوری کوشش کی ہے، یہ سب کچھ کیوں کیا گیا ہے؟ اپنے اغراض و مقاصد کی خاطر ان کو جھوٹے اور مکروہ پروپیگنڈا کی وجہ سے ڈاکو، خون خوار، بدمعاش اور جاہل کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے لیکن حق اور صداقت کی راہ کون روک سکتا ہے۔ دنیا دیکھتی ہے کہ آج ان لوگوں کا نام و نشان تک مٹ چکا ہے یا کسی مپرسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ جنہوں نے ان کی گردن جھکانے کی بھرپور کوشش کی تھی اور پختون قوم بدستور ایک فعال متحرک اور زندہ قوم کی حیثیت سے جی رہی ہے۔

برعظیم پاک و ہند کے لوگوں میں علامہ اقبال ایک عظیم شخصیت کے مالک ہیں۔ اس نابغہ فلسفی شاعر نے جنہوں نے اپنی شاعری کی بنیاد اسلام ہی کو ٹھہرایا تھا، دنیا کے بکھرے ہوئے مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی سعی کی تھی۔ تاکہ وہ استعمار کے خونی پنجہ سے آزاد ہو سکیں اور ایک بار پھر دنیا کو امانت کا، دیانت کا، صداقت کا اور شجاعت کا مثالی اور عملی نمونہ پیش کر سکیں اور مسلمان بحیثیت ایک قوم خود اپنی تقدیر کے مالک ہو سکیں یہی وجہ ہے کہ ان کا زیادہ تر خطاب مسلمان قوم سے ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان میں یکجہتی اور اتفاق کا جذبہ پیدا ہو لیکن اگر دیکھا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ علامہ اقبال جو گہری عقیدت پختونوں کے ساتھ رکھتے تھے اور ان سے کچھ کرنے کی امید رکھتے تھے۔ وہ انہوں نے دنیا کی کسی اور مسلم قوم سے نہیں رکھی۔ چاہے وہ ترک ہو، عرب ہو، ایرانی ہو یا ہندی مسلمان کیونکہ ان کو اپنی منزل صرف اور صرف پختونوں کے وجود میں نظر آتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ان کے ساتھ گہرا رشتہ قائم کیا تھا۔

علامہ اقبال کا پختونوں کے ساتھ اتنا گہرا لگاؤ نہ کوئی غیر اتفاقی تھا اور نہ کسی حادثہ کی پیداوار۔ علامہ بڑے مردم شناس تھے دنیا کی ہر قوم کی تاریخ ان کے سامنے تھی تمام اقوام کی شجاعت، محبت، خلوص، وطن دوستی، جذبۂ آزادی اور اسلام دوستی کا اندازہ لگانے کے بعد فرمایا کہ

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مردِ کوہستانی

لیکن جب ترکوں، ایرانیوں اور عربوں نے علامہ اقبال کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ ؎

نہ مصطفےٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روحِ مشرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

اور

ترکانِ جفا پیشہ کے پھندے سے نکل کر بے چارے ہیں تہذیب کے پھندے میں گرفتار

تو علامہ اقبال کی نظر صرف اور صرف پختونوں پر آکر ٹھہری۔ کیونکہ وہ جن لوگوں کی تلاش میں تھے وہ صرف اور صرف پختون ہی تھے۔

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد میری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

اور اس بات کی شہادت ان کے تمام کلام سے مل سکتی ہے چاہے وہ نظم میں ہو یا نثر میں۔ پختونوں کے بارے میں علامہ اقبال کا مطالعہ بڑا گہرا تھا۔ انہوں نے ان کے بارے میں بہت کچھ پہلے ہی پڑھ لیا تھا۔ لیکن جب وہ یورپ، عرب اور مشرقِ وسطیٰ وغیرہ دیکھنے کے بعد پختونوں کے علاقہ میں آئے تو ان کا مطالعہ مشاہدہ میں بدل گیا اور وہ بھانپ گئے کہ یہ بلند و بالا کہسار اور پتھریلی زمین واقعی کچھ نرالی تاریخ، روایات اور اوصاف رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے پختونوں کے بارے میں ایسی باتیں کہی ہیں۔ جن کا خود پختونوں کو بھی پتہ نہ تھا۔

بعض ادیب یہ سوال اٹھاتے ہیں۔ کہ علامہ اقبال کی افغان شناسی کس بات اور کس چیز کی مرہونِ منت تھی اور ان کی افغان شناسی کے ذرائع کیا تھے۔ اس بارے میں مختلف ادیب مختلف راستے ڈھونڈتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ ایک پختون رسالدار کے ساتھ علامہ کی دوستی تھی اور کوئی کہتا ہے کہ فلاں پختون ان کے آشنا تھے اور کسی کا خیال ہے کہ کابل گئے تھے اور بعض اصرار کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ خوشحال شناسی کا نتیجہ ہے۔ مانتا ہوں کہ یہ سب کچھ اپنی جگہ صحیح اور درست ہو گا۔ لیکن ان کی پختون شناسی ان چیزوں تک محدود نہ تھی کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو پھر ان کے کلام میں پختون کا فی سمٹا ہوا اور محدود ہوتا۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی کوئی ایسی کتاب نہیں جو پختون کے ذکر سے خالی ہو۔ اگر ان کا کلام گہری نظر سے دیکھا جائے تو اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ پختونوں کی تاریخ، ان کے ضابطۂ حیات، اسلام دوستی، جذبۂ جہاد، اپنی آزادی پر مٹ مرنا، سادہ مگر پُر وقار زندگی، باہمی مساوات جس میں نہ کوئی چھوٹا ہوتا ہے نہ کوئی بڑا، ان کی سخت کوشی، اپنی بات اور زبان پر قائم رہنا، امام اور ملاؔ کی بات کو توڑنا کفر کے مترادف سمجھنا وغیرہ، سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ ان کی ضرب المثل بے اتفاقی، معمولی معمولی باتوں پر جھگڑے اور قتل، رسم و رواج، غمی اور شادی کی تقاریب اور رسوم یہاں تک کہ ان کی نسل، زبان و ادب کے بارے میں بہت کچھ جانتے تھے اور ان تمام چیزوں کی گواہی ان کی تحریریں دیتی ہیں۔ لیکن یہ تاریخ کی ایک تلخ حقیقت ہے کہ برصغیر میں جتنی زیادتی مورخین نے پختونوں کے ساتھ کی ہے، اتنی کسی اور کے ساتھ نہیں کی۔ جو مکروہ پروپیگنڈا پختونوں کے خلاف مغلوں، سکھوں، مرہٹوں اور فرنگیوں نے کیا ہے وہ کتابوں میں موجود ہے آزاد وطن کے مورخین کا قومی فرض تھا کہ اس غلط پروپیگنڈے کا ازالہ کرتے لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ انہوں نے الٹا اپنی طرف سے مرچ مصالحہ ڈال کر نہ صرف پختون کے ساتھ ناانصافی کا ثبوت دیا بلکہ علامہ اقبال کی روح کو بھی تکلیف پہنچائی۔

علامہ اقبال اگر تمام ایشیا کو جسم سمجھتے تھے تو پختون کو اس کا دل قرار دیتے تھے علامہ نے پختونوں کا اتنا گہرا مطالعہ کیا تھا کہ جب بھی کوئی پختون ان کا کلام پڑھتا تو وہ ہرگز یہ محسوس نہیں کرتا کہ وہ کسی غیر پختون کا کلام پڑھ رہا ہے۔

اس سے پہلے کہ میں بحث کو آگے بڑھاؤں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ علامہ اقبال پختونوں کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے اور ان سے ان کو کیا توقعات تھیں، اور وہ ان سے اتنے متاثر کیوں تھے؟

علامہ اقبال پشتو زبان کی قدامت اور اس کی تیز و تند شاعری سے اچھی طرح واقف تھے۔ اور پشتو نہ جاننے کا انہیں افسوس تھا۔ کیونکہ ان کی شاعری ان کی نفوذ اور رقت کیلئے پشتو جیسی تیز اور تند زبان کی ضرورت تھی۔ ان کا بہترین کلام جو فارسی زبان میں ہے۔ بس کے بارے میں یہ معلوم ہے کہ "فارسی زبان بزم است و پشتو زبان رزم" یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے ایک پختون دوست کو لکھا تھا کہ "یہ بہت اچھی بات ہے کہ آپ کے خاندان میں اپنے بزرگوں کا سا ذوق سخن باقی ہے افسوس کہ مجھے پشتو نہیں آتی ورنہ میں سرحد کی اس مارشل شاعری کو اردو یا فارسی کا جامہ پہناتا" علامہ اقبال پشتو کے مشہور گیتوں ٹپے سے بھی آشنا تھے جو "یہ قربان" سے شروع کیے جاتے ہیں۔ علامہ اقبال کے سکریٹری اور ان کے کلام کے مشہور شارح سلیم چشتی صاحب ضرب کلیم کی شرح میں لکھتے ہیں کہ علامہ اقبال نے اپنی مشہور نظم "ادغامل افغان" پشتو کے مشہور گیت "مو قربان" کی دھن میں لکھی تھی۔

علامہ اقبال نے ۱۹۲۸ء میں حیدرآباد دکن کے اسلامک کلچر میں خوشحال خان خٹک پر ایک مضمون بعنوان "خوشحال خان خٹک افغانوں کا ایک جنگ جو شاعر" لکھا تھا "افغان نسل کے اتحاد کی تحریک ہماری آنکھوں کے سامنے ابھی تک جاری و ساری ہے جو وسط ایشیا میں تاریخ کے دلچسپ ترین ابواب میں ایک باب کی تشکیل کرتی ہے۔ ہندوستان میں لودھی اور شیر شاہ سوری سرحد کے قبائل میں خٹک شاعر خوشحال خان اور افغانستان کے مرحوم عبدالرحمان خان اور ان کے پوتے امیر امان اللہ خان اس دلچسپ ترین تحریک میں ممتاز شخصیتوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ دن دور نہیں جب کوئی افغان مورخ اپنی نسل کی داستان ہمیں بالکل اسی طرح سنائے گا جس طرح بولنس لنگ نے اٹلی کے اتحاد کی داستان سنائی تھی۔ میں اسلامک کلچر کے قارئین کے سامنے خوشحال خان کی شاعری کے چند نمونے پیش کرتا ہوں جس کی قدر و قیمت اور اہمیت سے اسی افغانوں کو آشنا ہونا ہے۔ - - - - - - - مجھے امید ہے کہ افغانستان کے وزیر تعلیم کی ایسے افغان محقق کو اس بات پر مامور کر دیں گے جو پشتو زبان کے اس عظیم مجاہد شاعر کا تنقیدی مطالعہ کرے اور اس کے علم و ادبی کارناموں کا ایک مکمل ایڈیشن تیار کرے" (خوشحال اور اقبال)

علامہ اقبال کی یہ آرزو کہ پشتو زبان کے اس عظیم مجاہد شاعر کا تنقیدی مطالعہ پیش کیا جائے ان کی زندگی میں یوں پوری ہوئی کہ جس زمانہ میں علامہ اقبال، خوشحال خان خٹک پر بھرپور کام کرنے کی خواہش کر رہے تھے۔ پنجاب کی ایک عالم و فاضل پٹھان خاتون محترمہ خدیجہ فیروزالدین نے پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کے لیے خوشحال خان خٹک کا موضوع منتخب کیا موصوفہ نے اپنے اس تحقیقی مقالے کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ اس کام سے علامہ اقبال کو خاص دلچسپی تھی اور وہ ان سے وقتاً فوقتاً اس سلسلے میں صلاح و مشورہ کرتی رہیں (جدید پشتو ادب)

احمد شاہ ابدالی کو بحیثیت ایک مسلمان حکمران تو سب اچھی طرح جانتے تھے لیکن یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم تھی کہ وہ ایک مایہ ناز شاعر بھی تھے علامہ اقبال ان کی اس خوبی سے اچھی طرح واقف تھے چنانچہ فرماتے ہیں ؎

شل فاتح ان امیر صف شکن
سکہ ھم زد بہ اقلیم سخن

۱۹۳۴ء میں جمال الدین احمد اور محمد عبدالعزیز نے افغانستان کے بارے میں انگریزی میں ایک کتاب لکھی تو مقدمہ لکھنے کے لئے

ان کی نگاہِ انتخاب علامہ اقبال پر پڑی علامہ نے اس کتاب کے مقدمہ میں نادر شاہ کے بارے میں حسب ذیل تاثرات لکھے
"مجھ سے کہا گیا ہے کہ افغانستان پر اس نفیس کتاب کے پیش گفتار کے طور پر چند سطریں لکھ دوں۔ مجھے اس فرمائش کے پورا کرنے میں خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ نہ صرف اس لیے کہ میں افغانوں کا ایک جفاکش اور سخت کوش جاندار قوم کی حیثیت سے احترام کرتا ہوں۔ بلکہ اس لیے بھی کہ مرحوم نادر شاہ کو شخصی طور سے جاننے کی عزت بھی مجھے حاصل ہے۔ وہ مجاہد، سیاست دان جس کی شخصیت نے اس کی قوم میں ایک نئی جان ڈال دی تھی اور جدید دنیا کو سمجھنے کے لیے نظر بخشی۔ (ماہنامہ المعارف اگست ستمبر ۱۹۷۵ء)

(وہ آگے چل کر لکھتے ہیں وہ ملت جس نے محمد غوری، علاؤ الدین خلجی، شیر شاہ سوری، احمد شاہ ابدالی، امیر عبدالرحمان اور آخر میں نادر شاہ اور سب سے اعلیٰ و برتر مولانا سید جمال الدین افغانی (جو ایشیا کی عظیم ترین شخصیات میں گنے جاتے ہیں) دنیا کو دیئے جمال الدین افغانی کے مشن اور شخصیت سے علامہ اقبال بہت ہی متاثر تھے۔ ان کے بارے میں ان کا کہنا تھا۔ کہ زمانہ حال میں میرے نزدیک اگر کوئی شخص مجدد کہلانے کا مستحق ہے تو وہ صرف جمال الدین افغانی ہیں۔ مصر و ایران و ترکی و ہند کے مسلمانوں کی تاریخ جب کوئی لکھے گا تو اسے سب سے پہلے عبدالوہاب نجدی اور بعد میں جمال الدین افغانی کا ذکر کرنا ہوگا۔ موخرالذکر ہی اصل میں موسس ہے۔ زمانہ حال کے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا، اگر قوم نے ان کو عام طور پر مجدد نہیں کہا یا انہوں نے خود اس کا دعویٰ نہیں کیا تو اس سے ان کے کلام کی اہمیت میں کوئی فرق اہل بصیرت کے نزدیک نہیں آتا[1] (اقبال نامہ)

علامہ اقبال کی پختون نوازی کے بارے میں سلیم چشتی صاحب کا بیان ہے کہ علامہ نے فرمایا تھا۔ کہ ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے غلامی کی زندگی گذار رہے ہیں۔ اگر فرنگی کا مقابلہ کوئی بھی کر سکتا ہے تو وہ صرف مسلمان کر سکتے ہیں جو کابل اور پشاور کے درمیان میں رہتے ہیں۔ کاش! خدا کا کوئی بندہ ان بیمار چیتوں کو بیدار کر دے۔

پشتو زبان کے ایک عظیم ادیب فضل حق شیدا اپنی طالب علمی کے وقتوں کا ایک واقعہ بتاتے ہیں۔ کہ ایک دن ہم تین ساتھی لاہور میں علامہ اقبال کی خدمت میں ملاقات کے لیے حاضر ہوئے تو علامہ اقبال ہمیں دیکھ کر کہنے لگے کہ تم پختون طالب علم ہو میں تمہیں گلے ملنا چاہتا ہوں پھر کہنے لگے کہ پختونوں کو دیکھ کر میں بڑا خوش ہوا کرتا ہوں۔ اس قوم نے اسلام کی بڑی خدمت کی ہے۔ اور میں توقع کرتا ہوں کہ آئندہ کے لیے بھی یہ اسلام کی عظمت اور سربلندی کے لیے بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔ برخوردارو! دنیا کی بڑی بڑی قومیں ترقی پانے کے بعد زوال پذیر ہوئی ہیں اور آج کل تم جو ترقی یافتہ قومیں دیکھتے ہو وہ بھی روبہ زوال ہیں۔ لیکن پختونوں کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم ابھی بچپنے کی حالت میں ہے۔ یہ آہستہ آہستہ آگے بڑھے گی اور وہ زمانہ عنقریب ہے کہ یہ پورے شباب پر ہوگی خدا کرے کہ میں اس قوم کو عالم شباب میں دیکھ سکوں! میں آزاد مملکت کا تصور کرتا ہوں مجھے امید ہے کہ پختون اپنے دیرینہ اسلامی روایات کے مطابق اس کے قیام میں پوری مدد [illegible][2]

پختون تعلیم کے میدان میں بہت پیچھے ہیں اور یہ سب کو معلوم ہے کہ جب تک کوئی قوم تعلیم کے زیور سے آراستہ نہ ہو

---

[1] اقبال نامہ ص ۲۲۲
[2] انجمن

وہ ترقی کا تصور تک نہیں کر سکتی اور پختونوں کے بارے میں یہ بات علامہ اقبال سے چھپی نہ تھی۔ اس لیے جب پختونوں کے لیے کالج اور یونیورسٹی کا بندوبست ہونے لگا۔ تو علامہ اقبال اس پر بڑے خوش ہوئے اور کابل میں یونیورسٹی کے قیام کے موقع پر کہا کہ "تعلیم یافتہ افغانستان، ہندوستان کا بہترین دوست ہوگا۔ کابل میں ایک نئی یونیورسٹی کا قیام اور ہندوستان کے شمال مغربی علاقہ میں اسلامیہ کالج، پشاور کو ایک دوسری یونیورسٹی میں تبدیل کرنے کی اسکیم ہندوستان اور افغانستان کے درمیانی علاقے میں رہنے والے ہوشیار افغان قبیلوں کی سدھار میں بہت زیادہ ممد ثابت ہوگی۔ (اسلامی تصوف اور اقبال ص ۲۱۵)

علامہ اقبال اور پختون ایک دوسرے کے ساتھ بندھے ہوئے تھے اقبال پشتونوں کو اپنا سمجھتے تھے اور پشتون اقبال کو اپنا تصور کرتے تھے۔ پختون اقبال کا ہر دکھ درد اپنا درد تصور کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب علامہ اقبال کی مالی حالت اور صحت بہت خراب ہوگئی اور اس وقت ان کو مالی مدد کی ضرورت تھی تو بقول صہبا لکھنوی، تاریخ و تہذیب کے ان صداقت آفرین ابدی رشتوں سے کون ہے جو انکار کر سکے۔ ادیب و مفکر بھی انسانی تہذیب کا ایک اہم حصہ ہیں۔ اس لیے ان کی دستگیری اور اعانت بھی اتنی ہی ضروری ہے۔ جتنی کہ زندگی کے لیے سانس۔ اس حقیقت پر کتنے لوگوں کی نظر رہی اور اقبال ایسی عظیم شخصیت کو آزمائش کے انتہائی صبر آزما لمحوں میں کس کس نے کتنی مدد دی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ افتخار سچ پوچھئے تو نہ حیدرآباد کو حاصل ہو سکا نہ کسی اور ریاست کو بجز ریاست بھوپال کے جس نے اقبال ایسے آفاقی شاعر کو اس کی زندگی میں ہی نواز کر زندہ دوستی اور اعتراف عظمت کی ایک عہد آفریں مثال قائم کی۔

علامہ اقبال نذیر نیازی صاحب کو خود لکھتے ہیں۔

ڈیر نیازی صاحب السلام علیکم

اعلیٰ حضرت نواب صاحب نے میری لائف پنشن پانچ (سو) روپیہ ماہوار کر دی اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔ انھوں نے میرے ساتھ عین وقت پر سلوک کیا۔ اب اگر صحت اچھی رہی تو بقیہ ایام قرآن شریف پر نوٹ لکھنے میں صرف کروں گا۔

والسلام محمد اقبال لاہور یکم جون

(اقبال اور بھوپال ص ۸۹۰۸) یہ نواب بھوپال کون تھے؟ اور سر راس مسعود کون؟ جن کی وساطت سے یہ پنشن ملی تھی تو سنیئے! نواب صاحب بھوپال، حمید اللہ خان تھے جو تیراہ (صوبہ سرحد) کے ایک باوقار پختون کے چشم و چراغ تھے۔ اور سر راس مسعود تو وہ بھی عظیم مصلح سر سید احمد خان کے پوتے تھے اور نسلاً غزنی کے سید پختون تھے۔

آخری وقت تک پختون، علامہ کے ساتھ اپنی عقیدت کا اظہار کرتے رہے۔ جب علامہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ تو پختونوں کی آخری عقیدت پر ان کی قبر آج بھی گواہی دے رہی ہے۔ اور اس طرح پختونوں نے اول سے لے کر آخر تک اقبال کے ساتھ اپنی پختونی قائم رکھی۔ اور آج بھی پختون ان کی تعلیمات، ارشادات اور پند و نصائح سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کی راہ پر گامزن ہیں۔

اقبال مشاہیرِ عالم کی نظر میں

دردانہ جلیل ایم اے

اقبال کو صرف بہ حیثیت شاعر ہی دیکھا جائے تو بھی وہ اردو ادب میں بلاشبہ ارفع ترین مقام پر فائز ہیں۔ شاعر کے تمام بنیادی لوازمات یعنی جدتِ فکر، رفعتِ خیال، نازک بیانی، انتخابِ الفاظ اور ترنم ان کی شاعری میں تکمیل کے درجے تک موجود ہے۔ اردو ادب میں غالب اپنی جدتِ فکر اور ندرتِ خیال کے سبب بہت بلند ہیں۔ مگر میری نظر میں ان کے ہاں بسا اوقات ایک خامی بھی ملتی ہے وہ یہ کہ ان کے خیالات کی پرواز بعض مقامات پر اتنی بلند ہے کہ وہ نظر سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور ہم الفاظ کے پیچ وخم میں الجھ کر رہ جاتے ہیں غالباً اس کی وجہ تخیل کی بسرعت پرواز ہے اور ہماری نااہلی۔ یہ بات اقبال کے ہاں نہیں ہے اقبال کو لوگ عموماً صرف ایک مصلحِ قوم کا درجہ دیتے ہیں اسی وجہ سے ان کا کلام بھی اسی روشنی میں پڑھتے ہیں مضمون کی بلندی شاعرانہ نزاکتوں پر توجہ دینے نہیں دیتی۔ بعض ناقد حضرات نے تو اقبال کو شاعر ہی نہیں مانا صرف مصلحِ قوم ہی کا خطاب دیا یہ انصاف نہیں ہے اقبال مصلح ضرور ہے مگر تعلیمات کے لیے ذریعہ اظہار شاعری ہے نثر نہیں اور شاعری ترنم کا بھی نام ہے ان کے اشعار میں اگر جوش و ولولہ اور امید ہے تو دلنواز موسیقی بھی ہے جو مشرقی شاعری کی جان ہے۔ بعض طویل ترین نظمیں بھی اس قدر مترنم ہیں کہ ہم زیرِ لب اس کو پڑھ ہی نہیں سکتے۔ الفاظ کے زیر و بم کے ساتھ دل دھڑکتے ہیں اور بے اختیار گنگناہٹ پیدا ہو جاتی ہے ؎

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا		میں ہلاکِ جادوئے سامری تو قتیلِ شیوہ آذری

اقبال خود اپنے عظیم کلام کے دوران کسی لمحہ یہ نہیں بھولتے کہ وہ شاعر بھی ہیں۔ ان کی نظم "تصویرِ درد" فطرت کی عکاسی میں تشبیہات کا ایک نادر نمونہ ہے۔ الفاظ کی حسین بندش اور تشبیہات کے برمحل استعمال کے لحاظ سے پورا ادب اس سے بہتر نظم پیش نہیں کر سکتا۔ "مسجد قرطبہ" بھی ان کی ایک طویل اور شاہکار نظم ہے اس کی روح پر غور کیجئے اس میں ایک دردمند دل رکھنے والا شاعر شاندار ماضی کے کھنڈر پر کھڑا ہو کر محض ماضی کا ماتم نہیں کرتا بلکہ مستقبل کا خواب بھی دیکھتا ہے اس مسجد کے ساتھ جو عظمت جاہ و جلال وابستہ ہے اسے وہ اس عشق کی روشنی میں دیکھتا ہے جو کبھی مسلمان کا سرمایہ تھا۔ تاریخی یادوں میں دیر تک غرق رہنے اور مستقبل کا لائحہ عمل مرتب کرنے کے بعد دفعتاً اقبال کو اپنے شاعر ہونے کا احساس ہو جاتا ہے اور وہ شام کا منظر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

وادیٔ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب		لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب

کتنی پیاری تشبیہ ہے کیسے حسین الفاظ ہیں کتنی مکمل شاعری ہے "لعل بدخشاں کے ڈھیر" کون کہتا ہے کہ اقبال شاعر نہیں۔ غالب پیغمبر سخن ہے، غالب شاعری کی آبرو ہے مگر کون نہیں جانتا کہ بعض اوقات، بلکہ اکثر ان کے کلام میں قنوطیت کا اظہار ہوتا ہے۔ مگر کیا جس شاعری میں قنوطیت کا اظہار نہ ہو وہ شاعری کے زمرے سے خارج ہو جاتی ہے؟ اقبال نے "بادہ و ساغر" کے بہت سے طریقے غالب سے سیکھے ہیں مگر قنوطیت نہیں اس بنیاد پر ان سے بہ حیثیت شاعر منکر ہو جانا ناانصافی ہے۔

حالی اور اکبر نے بھی کم و بیش اس انداز پر شاعری کی ہے جو اقبال کا مقصد تھا۔ یہ دونوں بزرگ اپنے مقاصد میں پیچھے تھے اور قوم کا مرض سمجھتے تھے گو کہ علاج تجویز نہ کر سکے۔ صرف ماضی کے کارنامے سنا کر یا طنز و تشنیع سے مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ حالی شاعر ماضی، اکبر شاعر حال اور اقبال شاعر ماضی و حال کے علاوہ شاعر مستقبل بھی ہیں۔ اقبال نے حالی کی طرح قوم کو اس کا عظیم الشان ماضی بھی یاد دلایا ہے مگر ان کی طرح قوم کی بے حسی سے مایوس نہیں۔ اکبر کی طرح طنزیہ لہجہ بھی اختیار کیا ہے مگر دلآزاری نہیں کی۔ غالب کی طرح تخیلات بلند بھی پائے ہیں مگر خود کو قاری کی نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ میر کی طرح برسوں روئے بھی ہیں مگر ذاتی غموں کے لیے نہیں۔ انھوں نے مسائل تصوف بھی بیان کیے ہیں مگر رہبانیت سے بچ کر۔ غرض عطار و رومی، سنائی و سعدی حالی و اکبر میر و غالب عشق و خودی فقر و شاہبازی فلسفہ کی حکمتوں کے رازداں اور یزدانی صفات کے حامل مرد مومن کے مجموعہ کو اقبال کہا جا سکتا ہے۔

اقبالیات ہمارا قیمتی سرمایہ ہے۔ اقبالیات ہمارے لیے باعث فخر ہے۔ اقبالیات اسلام کا لائحہ عمل ہے۔ اقبال ہمارا ہے ہم جو بھی سمجھیں کم ہوگا۔ البتہ دیکھنا یہ ہے کہ ہمارا یہ سرمایۂ افتخار عالم کی نظر میں کیا ہے۔ چند آراء پیش خدمت ہیں۔

نواب صدر یار جنگ مرحوم اقبال نامے کے دیباچہ میں لکھتے ہیں "ان کا ذوق معرفت ادبی تھا جو عمیق تھا، ہمہ گیر تھا اس کے نہ ہونے سے ہماری علمی مجلسیں بے کیف ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یورپ کی تعلیم نے سونے پر سہاگے کا کام کیا مگر یہ سونا پرانی کان کا تھا آج کے تعلیم یافتہ سہاگہ تو ڈالتے ہیں مگر سونا کہاں۔ جلا تو آجاتی ہے مگر جوہر کہاں نکھرتے ہیں۔"

علامہ شبلی نے ۱۹۱۱ء میں اقبال کو ملک الشعرا کہا۔

میر آزاد بلگرامی اقبال کو حسان الہند کہتے ہیں۔

حضرت شاہ سلیمان پھلواروی اقبال کو فرزدق ہند کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

اکبر الٰہ آبادی لکھتے ہیں۔

حضرت اقبال میں جو خوبیاں پیدا ہوتیں ... قوم کی نظریں جو ان کے طرز کی شیدا ہوتیں
یہ حق آگاہی، یہ خوش گوئی، یہ طرز معرفت ... یہ طریق دوستی خودداری با تمکنت
اس کے شاہد ہیں کہ ان کے والدین ابرار تھے ... با خدا تھے، اہل دل تھے، صاحب اسرار تھے

رشید احمد صدیقی فرماتے ہیں۔

"میں تو یہاں تک سمجھتا ہوں کہ بہت سے مقامات پر اقبال خود اپنے آپ کو بہت پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ اگر یہ شاعری ہے تو پیغمبری کیا ہے اور اگر یہ پیغمبری ہے تو شاعری کا کیا درجہ ہے۔"

علامہ عبداللہ العمادی کلیات اقبال کے دیباچے میں فرماتے ہیں۔

"میر کا سوز، غالب کی جدت و اجتہاد، مومن کی نازک خیالی ذوق کی روانی و صفائی درد کی تاثیر و دلآویزی شیکسپیئر کی فطرت نگاری ملٹن کی پرواز فکر شیلے کی شیریں کلامی ورڈس ورتھ کی نیچر پرستی ٹینیسن کی فصاحت، کولرج کی موسیقی گوئیٹے کی حکمت شعاری یہ سب تنہا ایک اقبال کے کلام میں جمع ہیں۔" نیز اقبال کی عظمت و رفعت کا اعتراف یوں کرتے ہیں۔

تجھ پہ اے پنجاب نازل ہوں خدا کی رحمتیں
اے کہ تو اقبال کی دولت سے مالا مال ہے۔

ہم نے مانا تو نہیں مسحور تہذیب فرنگ
تجھ میں سب کچھ ہے اگر اسلام اور اقبال ہے۔

ڈاکٹر نظام الدین صدر شعبۂ فارسی عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن کا خیال ہے کہ اقبال کی ٹکر کا شاعر ابھی تک ایران پیدا نہیں کر سکا۔

سید محمد علی داعی الاسلام پروفیسر نظام کالج جو ایک مستند ایرانی نقاد ہیں۔ فرماتے ہیں "اقبال کوئی عادی شاعر نہیں جو فرضی عشق کی بنا پر گل و بلبل شمع و پروانہ کے مضامین باندھتے چلیں اقبال کا بلبل شاہین ہے جو کردہ مرغ کو شکار کرتا ہے ان کی بو گلشن ناہید تک پہنچتی ہے ان کی شمع بزم تمدن عالم کو روشن کرتی ہے۔ موصوف کا یہ بھی خیال ہے کہ" اگر اقبال ایران میں ہوتے اور صرف فارسی میں شاعری کرتے تو وہ ایرانی ادب کے اساتذہ میں ہوتے۔ میں تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اقبال نے جتنے قدر متاثر کیا ہے ایران کے جدید شعرا کے اشعار نے نہیں کیا"

مسٹر تیج بہادر سپرو لکھتے ہیں۔

"میں ایرانی فضلاء سے یورپ میں ملا ہوں انھوں نے اقبال کی فارسی زبان پر قدرت کاملہ کا مجھ سے اعتراف کیا ہے۔

پروفیسر براؤن ہندوستانی شعرا کی فارسی شاعری سے سخت بیزار تھے وہ بھی اقبال کی قابلیت کا اعتراف کرتے ہیں اور یوں رقم طراز ہیں۔

"میرے خیال میں وہ لوگ ناانصافی کرتے ہیں جو اقبال کو اسلامی شاعر کہتے ہیں یہ کہنا اقبال کے دائرہ اثر کو محدود کرنا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ انھوں نے اسلامی فلسفہ عظمت اور تہذیب پر بہت کچھ لکھا ہے لیکن کسی مذہب کے دانش وروں نے ملٹن کو عیسائی اور کالی داس کو ہندو کہہ کر اس کے فن کی قدر دانی میں کمی نہیں کی۔ اقبال ہم سب کا شاعر اور ترجمان ہے"

ڈاکٹر نکلسن جو اسرار خودی کے مترجم بھی ہیں فرماتے ہیں۔

"عہد حاضر کے ہندوستانی شعرا میں اقبال کا درجہ بہت بلند ہے۔ اس کے ساز سے دو قسم کے نغموں کی آواز آتی ہے پہلی صدا جو وطن کی حرمت کے جذبات کے لیے داد طلب ہے حالانکہ اقبال سیاسی حیثیت سے وطن پرست نہیں دوسرا نغمہ ایران کی شیریں زبان میں ہے۔ درحقیقت یہی وہ فیضیائی نغمہ ہے جو اپنی سحر کاریوں یا جادو بیانیوں سے آتشیں شعلے اور خاک دور دور پھیلا رہا ہے یقیناً یہ نغمہ عنقریب ایک الہامی آواز کی حیثیت اختیار کرنے والا ہے"

قابل احترام پروفیسر آرنلڈ لکھتے ہیں۔

ہندوستان میں حرکت جدید نے اپنا ظہور اقبال کی شاعری میں کیا ہے۔ انھوں نے برگساں اور نطشے کے کچھ خیالات کو اپنی ذاتی دنیا میں منتقل کیا ہے لیکن اقبال اپنے زبردست مطالعہ اور علم و فضل کے باوجود ہرگز ہرگز دوسروں کے خیالات کی بازگشت نہیں ہیں بلکہ امتیازی طور پر اور بحیثیت مفکر ہیں اپنی شاعری میں وہ رسول پاک کی شخصیت سے اپنی والہانہ عقیدت کا اظہار کرتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ محمدؐ کی کامل شخصیت کا ہر عمل قابل تقلید ہے۔ اس دماغ اعظم کا اثر مسلم نوجوان نسل پر عمیق ترین اور وسیع ہے"

مسٹر ہربرٹ ریڈ جو یورپ کے مستند نقاد ہیں کہتے ہیں۔

"والٹ وھٹ مین کا نصب العین نظری نہیں بلکہ عملی ہونے کی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتا ہے مگر ایک شاعر ایسا ہے جس میں یہ چیز نظر آتی ہے وہ بھی ہماری قوم کا نہیں۔ میری مراد اقبال سے ہے جو ہندی ہے۔ یہاں ہمارے ملک کے شعرا کیٹس کی پرانی ڈگر پر چل رہے ہیں اور بلبلوں پرندوں اور دوسرے ادنیٰ موضوعات پر لکھ رہے ہیں وہاں لاہور میں ایک ایسی نظم شائع ہو رہی ہے جس نے ہندوستانی نوجوانوں پر پوری طرح تسلط جمالیا ہے اقبال اس عہد کا مسیح ہے جس کی آتش نفسی نے مردوں کو زندہ کر دیا ہے آپ پوچھیں گے کہ آخر اس میں کون سی ایسی کشش ہے اس کا جواب یہ ہے کہ یہ معجزہ اس قسم کا نہیں جو مبلغ اور مصلح کے لیے مخصوص ہے بلکہ یہ اعجاز اس نظم کا ہے جس کے حسن و جمال کے آئینہ میں فلسفہ جدید کے اکثر پہلو منعکس ہوتے ہیں اس کی منطق ساری کائنات کے لیے آواز غیب کا حکم رکھتی ہے۔

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ماخذات

جلد اوّل

(احوال شعراء و مشاہیر)

مرتبہ : سرفراز علی رضوی

یہ تالیف کتابیاتی اور شخصیاتی معلومات و حوالہ جات کا ایک بیش بہا خزانہ ہے اور اردو دنیائے ادب میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔

قیمت : پچیس روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی

اقبال کا ایک شعر اور پہلی جنگ عظیم

ڈاکٹر ریاض الحسن

اقبال کی مشہور نظم "طلوع اسلام" ۱۹۲۲ء کے آخر میں شائع ہوئی۔ اس میں ترکوں کی یونانیوں پر فتح پانے کی تلمیحات کے ساتھ ساتھ اور کچھ بھی ہے۔ مثلاً یہ شعر لیجیے۔

ہوئے مدفون دریا زیر دریا تیرنے والے ۔۔۔ طمانچے موج کے کھاتے جو بن کر گہر نکلے

پہلے مصرع میں پہلی جنگ عظیم کے ایک مشہور واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ یہ واقعہ لارڈ کچنر سے نسبت رکھتا ہے۔ لارڈ موصوف اس صدی کے شروع میں لارڈ کرزن کے زمانے میں ہندوستان میں افواج برطانیہ کے کمانڈر انچیف تھے۔ لارڈ کرزن سے ان سے اَن بَن ہو گئی۔ لارڈ موصوف فوج پر بھی اپنا عمل دخل چاہتے تھے۔ اس کی لارڈ کچنر نے مخالفت کی کیونکہ ان کا سلسلہ براہ راست برطانیہ کے کمانڈر انچیف سے تھا۔ البتہ کمانڈر انچیف وائسرائے کی انتظامیہ کونسل کا ممبر ضرور رہتا تھا۔ ان دونوں کا مناقشہ برطانوی کابینہ تک پہنچا اور فیصلہ لارڈ کچنر کے حق میں ہوا۔ اس پر اکبر الہ آبادی کا شعر ہے جس کا یہ مصرع ہے۔

ع زن پہ نر غالب ہوا ۔ یعنی کرزن پر کچنر غالب ہوا۔

ہندوستان سے جانے کے کئی سال بعد کچنر کو مصر میں برطانیہ کا ہائی کمشنر مقرر کیا گیا۔ اور جب پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو اس کے بعد وزیر جنگ بنا دیا گیا۔ اس زمانہ میں اس کا مشہور پوسٹر شائع ہوا جس کے ذریعہ سے فوج میں بھرتی بہت تیز ہو گئی۔ اس پوسٹر میں کچنر کو ایک انگلی سے سامنے اشارہ کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا اور اس کے نیچے یہ عبارت چھپی تھی "تمھارے ملک کو تمھاری ضرورت ہے" اس کے کئی مہینے کے بعد اوائل ۱۹۱۵ء میں برطانوی کابینہ نے لارڈ کچنر کو ایک آبدوز کشتی کے ذریعہ روس سے کچھ ضروری معاملات پر گفت و شنید کرنے کے لیے بھیجا۔

اُس وقت کے وزیر اعظم مسٹر آسکوئتھ کی بیوی بڑی شوخ اور تیز زبان تھی۔ انتہا درجے کی فقرے باز تھی۔ فقرے کسنے میں بڑی مشاق تھی۔ وزیر اعظم نے کچنر کو رات کے کھانے پر بلایا اور اس کے دوسرے یا تیسرے دن وہ اپنی روسی مہم پر روانہ ہونے والے تھے۔ اسکوئتھ کی بیوی نے جب دعوت کے انتظام کے لیے اپنے خانساماں کو حکم دیا تو ضمناً یہ بھی کہہ دیا کہ لارڈ موصوف فلاں روز ایک آبدوز کشتی میں روس جانے والے ہیں۔ وقت کم ہے اس لیے جلدی انتظام کرنا ہوگا خانساماں کا ایک دوست تھا جو جرمنوں کی طرف سے جاسوسی کرتا تھا۔ اس کو پتہ لگا تو اس نے یہ خبر جرمنی پہنچا دی۔ جب لارڈ موصوف ایک آبدوز کشتی میں روس چلے تو جرمنوں نے ٹھیک نشانہ لگا کر کشتی غرق کر دی اور آج تک

پتہ نہیں چلا کہ لارڈ کچنر کس موقع پر اور کس وقت دریا برد ہو گئے۔

اب اقبال کا اشارہ اسی واقعہ کی طرف ہے کہ جو زیر دریا تیرتے تھے وہ دریا ہی میں دفن ہو گئے اور جو حوادث زمانے کے طمانچہ کھاتے رہتے یعنی ترک، وہ کامیاب اور بامراد ہو گئے۔

انجمن کی تازہ ترین پیش کش

اختر شیرانی اور جدید ادب

مصنفہ

ڈاکٹر یونس حسنی

صفحات ۵۴۴ قیمت پچیس روپے

انجمن کی مطبوعات

۱۔ افکار حالی ۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق
۲۔ پاپولر انگلش اُردو ڈکشنری بابائے اردو مولوی عبدالحق
۳۔ مقالات گارساں دتاسی (حصہ دوم) بہ نظرثانی جناب ڈاکٹر حمید اللہ خاں پیرس (فرانس)
۴۔ مصطلحات علوم وفنون عربیہ از محی الدین اجمیری
۵۔ فہرست مخطوطات جلد چہارم افسر صدیقی امروہوی
۶۔ افکار عالیہ از ڈاکٹر خان رشید
۷۔ تحریک آزادی میں اُردو کا حصہ ڈاکٹر معین الدین عقیل

کتابیں زیر طباعت

۱۔ نکات الشعراء ۲۔ بدائع الشعرا ۳۔ عقد ثریا
۴۔ مشاہیر یونان وروما ۔ جلد اول ودوم ۵۔ فہرست مخطوطات جلد پنجم ۶۔ بلغاریہ کی کہانیاں وغیرہ

انجمن ترقی اردو پاکستان ۔ بابائے اُردو روڈ ۔ کراچی ۱

حافظ محمود شیرانی مرحوم

سر شیخ عبدالقادر

میں نے شمع علم کے کئی پروانے دیکھے۔ مگر حافظ محمود شیرانی جیسا سوختہ جان کم دیکھا میں نے انہیں سب سے پہلے انگلستان میں دیکھا جب میں بھی طالب علم تھا اور وہ بھی۔ پھر وہ مجھے لاہور میں میری واپسی سے کئی سال بعد ملے اور یہیں سالہاسال رہے۔ پھر اس زمانے کے قریب جب وہ پنجاب سے اپنے بزرگوں کے وطن یعنی ریاست ٹونک کو گئے، اور پنجاب نے انہیں بادلِ ناخواستہ رخصت کیا وہ یہاں سے اس طرح گئے، جیسے یہ وطن تھا اور وہ پردیس۔

ولایت میں وہ کوئی سات سال رہے۔ پہلے دو تین سال تو انہیں انگریزی سیکھنے میں لگے۔ ہندوستان سے وہ منشی فاضل کا امتحان پاس کر کے گئے۔ اس سے پہلے وہ قرآن شریف حفظ کر چکے تھے۔ فارسی اور عربی منشی فاضل کی پڑھائی کرتے ہوئے حاصل کی تھی۔ میں جب ولایت سے چلا وہ ابھی انگریزی سیکھ رہے تھے۔ مطالعہ کا شوق بیحد تھا۔ لندن کے کتب خانوں میں جا کر کتب بینی میں مصروف رہتے وہاں مشرقی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ برٹش میوزم میں ہے۔ اور دوسرا انڈیا آفس میں۔ دونوں میں فارسی عربی کی قلمی کتابیں بکثرت موجود ہیں۔ اور ان میں سے کئی ایسی نادر کہ اب خود مشرقی کتب خانوں میں اُن میں سے بعض کا وجود نہیں۔ اس طرح ہمارے مالی سرمایہ کے ساتھ ہمارا بہت سا علمی سرمایہ بھی دُوسرے ملکوں میں منتقل ہو چکا ہے۔ حافظ محمود شیرانی نے علمی دولت کو سمیٹنا شروع کیا۔ اور مالی سرمایہ سے یہ بے نیازی اختیار کی۔ اُن کے اس ذوق کے باعث انہیں وہاں کے قیام کے آخری سالوں میں برطانیہ کے ایک کتب خانہ کی فہرست کتب کی تیاری کا کام مل گیا۔ اور اس کا کچھ قلیل معاوضہ ملتا رہا۔ فہرست بنانا صرف اسی کو نہیں کہتے کہ کتابوں کے نام ترتیب سے لکھ دے بلکہ کتب خانوں کی اصطلاح میں فہرست بنانے والے سے یہ توقع ہوتی ہے۔ کہ وہ کتاب کے مضمون سے بھی کچھ آگہی رکھتا ہو۔ مصنف کے حالات سے بھی باخبر ہو اور یہ بھی جانتا ہو کہ وہ کس زمانے کی تصنیف ہے اور جو نسخہ اس کے سامنے ہے وہ کس زمانہ کی نوشت ہے۔ اس کام سے حافظ محمود صاحب کی دلبستگی کتابوں کی ان تفاصیل کے ساتھ روز بروز بڑھتی گئی۔ اور وہ اس فن کے ماہروں میں شمار ہونے لگے۔

جب لاہور میں مجھے حافظ صاحب پھر ملے۔ تو کسی یونیورسٹی کی ڈگری تو اُن کے پاس نہ تھی۔ مگر معلومات کا ذخیرہ وافر اُن کے سینے میں تھا۔ پہلے تو مجھے یہ سن کر مایوسی ہوئی کہ اتنے سال پردیس میں صرف کرنے اور نیک اور پاکیزہ زندگی بسر کرنے کے باوجود اُن کے پاس کوئی چیز نہیں۔ جو اقتصادی اعتبار سے قیمت رکھتی ہو۔ مگر جب مجھے اُن کی معلومات کی وسعت کا پتہ چلا۔ اور میں نے اُن کے بعض تحقیقی مقالے دیکھے جو انہوں نے اُردو میں لکھے تھے۔ تو وہ مایوسی جاتی رہی۔

نکل کر لوگوں سے ملتے۔ نہ نواب صاحب بہادر والیٔ ریاست کی خدمت میں سوائے ایک رسمی سلام کے حاضر ہوتے۔ تو لوگ انہیں تعجب کی نگاہ سے دیکھنے لگے اور اس کے متعلق چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ یہ شخص کسی غیر معمولی اور پیچیدہ راز کی خدمت پر مامور ہے اور اسی لیے گھر میں گھسا رہتا ہے اس بنا پر کسی نے نواب صاحب کے پاس ان کے متعلق بدگوئی کی۔ اور انہیں وہاں چین سے رہنا مشکل ہوا۔ اس لیے وہ لاہور چلے آئے کہ یہاں اگر کوئی ملازمت ملے۔ تو اس سے بسر اوقات کریں۔ لاہور کے اسلامیہ کالج میں اس وقت فارسی کے لیکچرار کی جگہ خالی تھی۔ کچھ کوشش کے بعد وہ جگہ انہیں مل گئی۔ اور انہوں نے لاہور میں سکونت اختیار کرلی کالج میں ان کی قابلیت کا اعتراف جلد شروع ہو گیا۔

کتابوں کا شوق انہیں اس حد تک تھا کہ کم سے کم خرچ پر اپنا گزارہ کرتے۔ اور جو کچھ بچتا اس سے کوئی پرانی قلمی کتاب خرید لیتے۔ کالج میں جب موسم گرما کی تعطیلات آتیں تو محمود شیرانی صاحب انہیں ایسے کسی شہر یا شہروں میں بسر کرتے جہاں انہیں معلوم ہوتا کہ پرانی کتابوں کا ذخیرہ کسی کے ہاں موجود ہے اور مناسب داموں پر مل سکے گا۔ وہاں جاکر وہ کتابوں کا جائزہ لیتے۔ اور جو چیز اُن کے مطلب کی ہوتی لے آتے اس طرح اُن کی اپنی خریدکردہ کتابوں کا مجموعہ جمع ہوتا گیا۔ جو بالآخر ایک معقول کتب خانہ بن گیا۔ اور جیسے وہ یہاں سے جاتے وقت پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری میں لاگت سے بھی کم داموں پر دے گئے۔

اسلامیہ کالج سے تعلق کے زمانے میں انہوں نے کئی مقالے لکھے۔ جو نئی معلومات سے پُر تھے۔ اور باعتبار طرز تحریر عام فہم اور پسندیدہ۔ ان سب میں بہتر اُن کی مشہور کتاب تھی۔ جو "پنجاب میں اُردو" کے نام سے شائع ہوئی۔ جس میں انہوں نے یہ ثابت کیا کہ اردو پنجاب کے راستے دہلی میں پہنچی۔ اور وہاں سے جلا پا کر اُردو کہلائی۔ اس نظریہ کے ثبوت میں انہوں نے کئی سو برس کے صوفیوں کے کلام کے نمونے پیش کئے۔ جو اُردو کے اچھے خاصے نمونے تھے۔ یہ نظریہ اب ہندوستان کے دوسرے حصوں کے ارباب تحقیق کے نزدیک بھی قابل قبول ہوتا جاتا ہے۔ یہ کتاب ایک سے زیادہ مرتبہ طبع ہو چکی ہے لیکن افسوس کہ اب نایاب ہے۔ سُنا ہے کہ انجمن ترقی اردو دہلی اسے دوبارہ شائع کرنے کا انتظام کر رہی ہے۔

لاہور کی علمی فضا حافظ محمود شیرانی کو بہت پسند تھی۔ اور وہ اپنے علمی مشغلوں کے لیے اسے ساعد پاتے تھے ان کی ضرورتیں کتابوں کی خرید کے شوق کو چھوڑ کر مختصر تھیں اور طبیعت میں قناعت اس قدر تھی کہ انہیں کئی دوسرے مقامات سے بلاوے آئے اور یہاں جو تنخواہ تھی اس سے بہتر تنخواہیں پیش کی گئیں مگر انہوں نے جانا پسند نہ کیا۔ البتہ بہت سے سال اسلامیہ کالج میں رہنے کے بعد شیرانی صاحب اورنٹیل کالج لاہور میں منتقل ہو گئے تھے۔ اور وہاں ان کی تنخواہ میں بھی ترقی ہوئی اور شہرت میں بھی اُن کے معاصر اور دوسرے پروفیسر انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اور بہت سے قابل اور مستعد طالب علموں نے اُن کے فیضِ صحبت سے محققانہ اندازِ تحریر سیکھا اور اب خود ممتاز اہلِ علم میں شمار ہوتے ہیں۔

پروفیسر شیرانی کو کتابوں کے جمع کرنے کے شوق کے ساتھ پُرانے فرامین اور کتبے اور سکے جمع کرنے کا بھی شوق ہو گیا تھا۔ اس میں انہوں نے حیرت انگیز ترقی کی۔ ایسے ایسے نادر سکے بہم پہنچائے اور اس خوبی سے اُن کو ترتیب دیا اور سجا کے رکھا کہ دُور دُور سے لوگ انہیں دیکھنے آتے تھے اور حیران ہوتے تھے کہ باوجود وسائل کی کمی کے ایک شخص کیسے ایسا مجموعہ مہیا کر سکا۔

لاہور سے جانے سے کچھ پیشتر ایک دن شیرانی صاحب نے مجھے اپنے مکان پر بلایا۔ کہ اُن کے مجموعہ کے بعض نوادر کو دیکھوں۔ گرمی کا موسم تھا۔ اور دوپہر کے بعد کا وقت۔ میں نے نوادر کو بھی دیکھا۔ اور ان کی داد دی۔ مگر اس سے زیادہ خود شیرانی صاحب کی داد دی

کیونکہ وہ بھی اپنی جگہ داخلِ نوادر تھے۔ گرمی کی وجہ سے ایک ہلکا سا بنیان پہنے ہوتے تھے۔ اور کمر کے گرد صرف ایک چھوٹا سا تہ بند باندھے بیٹھے تھے۔ پنکھا نہ دستی نہ بجلی کا۔ نہ گرمی سے بچنے کی فکر نہ پروا۔ کتابیں اور وہ۔ گرد و پیش فرامین اور رکے۔ یہ پروفیسر قنت کے لحاظ سے مغربی پروفیسروں سے زیادہ اور آسائش اور ماند و بود میں کسی غریب مسجد کے ملّا سے زیادہ سادہ تھا۔ شیرانی کی یہ آخری تصویر ہے جو میرے صفحۂ دل پر منقوش ہے۔ اب وہ دنیا میں نہیں ہیں لیکن اس کی یاد اُن کے بہور احباب کے دلوں میں موجود ہے۔ اور مرحوم کے لیے دُعائے مغفرت اُن کے لبوں پر ہے۔

انجمن ترقی اردو پاکستان کی ایک نادر پیش کش

اُردو - انگریزی لغت

مرتبہ

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

اس لغت کی ضرورت ایک مدّت سے محسوس کی جارہی تھی اور ایک خاص طبقے کی طرف سے بار بار اس کی اشاعت کا مطالبہ کیا جارہا تھا۔ جس میں اساتذہ اور طلبہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

۱۰۸۰ صفحات کی اس ضخیم لغت نے اس ضرورت کو بھی پورا کر دیا جو اردو سے انگریزی میں ترجمہ کرنے والوں کو پیش آتی ہے۔ لغت میں اردو الفاظ کے ماخذ اور صحیح تلفظ رومن رسم خط میں درج ہیں۔

انجمن ترقی اُردو پاکستان

بابائے اردو روڈ۔ کراچی نمبر ۱

توانائی کی
انتھک
مسلسل تلاش
قومی ترقی و توسیع کے بے شمار نئے منصوبوں پر
پاکستان تیز رفتاری سے گامزن ہے۔
ترقی کی اس رفتار کو قائم رکھنے کے لئے
ملک کو زیادہ سے زیادہ توانائی کی ضرورت ہے
آئل اینڈ گیس ڈیویلپمنٹ کارپوریشن
قدرتی ذخائر سے مالا مال زمین وطن سے
توانائی کی تلاش و فراہمی میں سرگرم عمل ہے
تپتے ہوئے صحراؤں میں
ہم دن رات، اپنی ترقی کی بنیادی قوت۔
توانائی کی تلاش کر رہے ہیں۔
OGDC
آئل اینڈ گیس
ڈیویلپمنٹ
کارپوریشن
ہمارا عہد۔ تیل میں خودکفیل پاکستان
Paragon 78 - 2

پروفیسر محمود شیرانی
اور
اُن کے مقالات

ثناء الحق صدیقی

مشہور محقق پروفیسر محمود خاں شیرانی کے مقالات اتنی بڑی تعداد میں ہیں کہ وہ آٹھ جلدوں میں جگہ پا سکے ہیں۔ یہ مقالات اگرچہ سب کے سب علمی و ادبی ہیں تاہم ان کے موضوعات نہایت متنوع ہیں۔ مثلاً ایک مقالہ ایران کے زندۂ جاوید شاعر فردوسی سے متعلق ہے تو دوسرے کا عنوان "مثنوی لیلےٰ مجنوں" ہے۔ اس تنوع کے باوجود ہر مقالہ میں شیرانی صاحب نے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔

شیرانی صاحب کی تحریروں کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے انھیں تحقیقی کاموں کے لئے بے پایاں صلاحیتیں عطا کی تھیں۔ ان کی پوری توجہ تحقیق پر مرکوز رہتی تھی جس موضوع پر بھی وہ قلم اٹھاتے تھے۔ اس کے ہر پہلو کی پوری طرح چھان بین کر لیتے تھے۔ اور ہر واقعہ کی تردید یا تائید کے لئے اندرونی اور بیرونی ہر طرح کے شواہد فراہم کر کے پیش کرتے تھے۔ ان کا طرزِ استدلال ایسا ہوتا تھا کہ ان کے کسی دعویٰ کو رد کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔ انہوں نے شبلی جیسے محقق کی بلند پایہ تصنیف "شعر العجم" پر تنقید کر ڈالی اور ایسے دلائل پیش کئے کہ ان کو شبلی کے متبعین ہی اپنی علمیت و فضیلت کی بنا پر رد کر سکے ورنہ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں کی نظر میں یہ عظیم تصنیف مشکوک و مشتبہ ہو گئی۔

شیرانی صاحب تحقیق کو سب چیزوں سے مقدم سمجھتے تھے۔ اور اس بات کی قطعاً پروا نہیں کرتے تھے۔ کہ اُن کی تحریر میں ادبیت، لطافت اور زبان کی دیگر خوبیاں پیدا ہوئی ہیں یا نہیں بلکہ تحقیقی مواد نہ ہونے کی صورت میں وہ زبان و بیان کی خوبیوں کو ہیچ سمجھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ تحقیق کے لئے محنت و جانکاہی کی ضرورت ہے۔ جو لوگ محنت کرنے کے عادی نہیں ہیں وہ رنگین عبارت کے پردے میں اپنی کوتاہی کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ شبلی اور ان کے متبعین کے بارے میں ان کا کہنا تھا "یہ ندوے والے چوٹ اور چٹکی سے کام نکالتے ہیں۔ بھڑک دار عبارت لکھی اور لوگوں کو اپنی طرف مائل کر لیا۔ ان میں محنتی کوئی نہیں اور ہمیں یہ مار کھاتے ہیں۔"[1]

بہر حال یہ شیرانی صاحب کا ذاتی نظریہ تھا ممکن ہے بہت سے حضرات ان کی رائے سے اتفاق نہ کریں۔ تاہم یہ بات ہر شخص ماننے پر مجبور ہے کہ ان کی اپنی تحریروں میں تحقیقی مواد کا غلبہ ہوتا ہے۔ نامناسب نہ ہوگا اگر کہہ دیا جائے کہ وہ تحقیق کے بغیر ٹکڑا نہیں توڑتے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے ان کی تحقیق کا طریقِ کار یہ بتایا ہے۔

"پروفیسر شیرانی کے تحقیقی طریق کار میں خاص اور نئی بات یہ معلوم ہوئی کہ وہ پرانی تاریخ و تہذیب کی سچائیوں تک پہنچنے کے لئے ان کتابوں سے بھی استفادہ کیا کرتے تھے جو زمانہ کی تاریخ سے متعلق ہیں مگر ان کا خاص طریق یہ تھا کہ غیر تاریخی کتابوں سے بھی تہذیبی رجحانات کا کھوج لگا لیا کرتے تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے۔ کہ صحیح مواد عموماً غیر متعلق کتابوں میں ملتا ہے۔ یہاں غیر شعوری طور پر ایسی باتیں درج ہو جاتی ہیں جو باقاعدہ تاریخوں میں سیاسی یا ذاتی اسباب کی بنا پر نظر انداز ہو جاتی ہیں۔"[2]

---

[1] نقوش شخصیات نمبر صفحہ ۱۵۷

[2] نقوش۔ شخصیات نمبر صفحہ ۱۵۷

شیرانی صاحب کے مقالات میں بھی تحقیق کا عنصر غالب ہے اور اگرچہ ان کی بعض تحقیقات کی دوسرے فضلا نے تردید کی ہے تاہم اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ انھوں نے تحقیقی مواد کی فراہمی میں محنت و مشقت سے کام لیا ہے۔

مقالات شیرانی کی زیر نظر جلد میں حسب ذیل نو مقالے ہیں۔

(۱) چند لمحے وکٹوریہ البرٹ میوزیم میں۔

(۲) قصہ چہار درویش۔

(۳) ملا دو پیازہ اور جعفر زٹلی کی سوانح عمریوں کا جائزہ اور تنقید۔

(۴) ایران کا زندہ جاوید شاعر "فردوسی"۔

(۵) مثنوی لیلے مجنوں

(۶) حالی اور مسدس حالی۔

(۷) دیوان خواجہ معین الدین چشتی۔

(۸) فارسی شاعری اور اُس کی قدامت

(۹) میر قدرت اللہ خاں قاسم اور ان کی تصنیف "مجموعۂ نغز"

پہلے مقالہ میں وکٹوریہ البرٹ میوزیم میں ہندوستانی سیکشن کے کچھ حصہ کا حال بیان کیا ہے۔ اور ایک ایک چیز کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ اس کو دیکھ کر شیرانی صاحب کی قوت مشاہدہ کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جاتا۔ اس مقالہ کو پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قاری خود شیرانی صاحب کے ہمراہ میوزیم میں گھوم رہا ہے اور شیرانی صاحب واقفِ راز کی حیثیت سے اس کو ہر شے کے رمز و حقیقت سے آگاہ کر رہے ہیں۔ نہ معلوم کتنے حضرات نے اس میوزیم کی سیر کی ہوگی لیکن شیرانی صاحب کی طرح کس نے داد تحقیق دی ہے۔ سلطان ٹیپو کے سامان کا انہوں نے جس گہری نظر سے جائزہ لیا ہے۔ اس سے ایک طرف ان کی سلطان سے عقیدت و محبت ظاہر ہوتی ہے اور دوسری جانب ان کا انداز تحقیق معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً زین پوش جیسی معمولی سی چیز کی تفصیلات وہ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"یہ زین پوش قرمزی مخمل کا ہے۔ چار فٹ آٹھ انچ لمبا اور چار فٹ ساڑھے آٹھ انچ چوڑا ہے۔ مخمل پر نہایت اعلیٰ درجہ کا زری کا کام ہوا ہے۔ یہ کام کسی استاد کے ہاتھ کا ہے۔ تمام میوزیم میں اس قدر صفائی کا نمونہ نہیں ملتا۔ بیل بوٹے اپنی وضع میں اعلیٰ درجہ کے ہیں اور جو نزاکت اور ستھرا پن کاریگر نے اس کام میں دکھایا ہے وہ لاجواب ہے۔ میوزیم نے چالیس پونڈ میں اس زین پوش کو خریدا ہے۔"[۱]

دوسرا مقالہ "قصہ چہار درویش" ہے۔ یہ قصہ میر امن دہلوی نے فورٹ ولیم کالج کے ایک اشتہار کے جواب میں "باغ و بہار" کے نام سے مرتب کیا تھا۔ اس قصہ کے شروع میں بتایا گیا ہے کہ "ایک مرتبہ حضرت نظام الدین اولیا رحمۃ بیمار ہوئے۔ ان کے محبوب مرید حضرت امیر خسرو نے اپنے مرشد کا دل بہلانے کے لئے یہ قصہ ان کو سنایا تھا۔ جب حضرت صحتیاب ہو گئے تو انہوں نے دعا دی کہ جو جا اس قصہ کو پڑھے گا وہ خدا کے فضل سے شفایاب ہوگا۔" اس واقعہ کو بیان کرنے کا مقصد یہ تھا کہ قصہ چہار درویش کو حضرت امیر خسرو کی تصنیف بتائی جائے۔ میر امن نے

[۱] مقالات شیرانی (کتاب منزل لاہور) بار اول ۱۹۳۸ء ص ۲۰

یہ واقعہ خود وضع نہیں کیا تھا ایک فارسی نسخے کی عبارت کی بنیاد پر اس قصہ کو امیر خسرو سے منسوب کر دیا تھا۔ اُن کے روایت کرنے سے یہ بات شہرت پا گئی اور اس قصہ کے مصنف امیر خسرو سمجھے جانے لگے کسی صاحب نے اس بات کی تصدیق چاہی۔ شیرانی صاحب کو تحقیق کا ایک موضوع ہاتھ آیا۔ انہوں نے داخلی اور خارجی شہادتوں سے یہ بات ثابت کر دی کہ اس قصہ کا امیر خسرو سے کوئی تعلق نہیں ہے انہوں نے یہ بھی انکشاف کیا کہ یہ قصہ ابتداءً فارسی زبان میں نہیں تھا بلکہ اس کی اصل ہندی ہے۔ محمد شاہ فردوس آرامگاہ کے زمانہ میں حکیم محمد علی نے بادشاہ کے ایماء سے اس کو ہندی سے فارسی میں منتقل کیا۔ اس وقت یہ مختصر تھا بعد میں اضافے کئے جاتے رہے جس سے آخر میں اس کی شکل کچھ سے کچھ ہو گئی۔ چونکہ مسلمان علماء مخرب اخلاق قصوں کی ہمیشہ سے مخالفت کرتے رہے ہیں۔ لہٰذا اس میں تقدس کا رنگ بھرنے کے لئے میر احمد خلف شاہ محمد نے اپنے نسخہ میں جو بہت بعد کی تصنیف ہے اس کو امیر خسرو کی تصنیف بتایا اور حضرت نظام الدین اولیا کی زبان مبارک سے اوروں کے حق میں دعا بھی کرادی۔ اس طرح شکر میں لپٹی ہوئی گولی کی طرح یہ داستان جس میں بعض حصے خاصے عریاں اور فحش ہیں مسلمانوں کے حلق سے آسانی کے ساتھ اترنے لگی۔ اب علماء بھی زیادہ شدت سے اس کی مخالفت نہیں کرتے۔

پروفیسر شیرانی مختلف شواہد و دلائل پیش کرنے کے بعد آخر میں رقم طراز ہیں۔

"محمد علی کے بیان کے سامنے کہ اس نے محمد شاہ بادشاہ کے حکم سے اس کتاب کا ہندی سے ترجمہ کیا ہے (امیر خسرو سے اس کا انتساب) کسی وقعت کا مستحق نہیں۔ اس روایت سے نہ صرف محمد علی ناواقف ہے بلکہ محمد حسین عطا خاں تحسین بھی اس سے بے خبر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت سب سے پہلے طبع شدہ فارسی نسخے سے شروع ہوئی اور میر امن نے اس سے نقل کی۔ باغ و بہار کے بیان نے اس کو شہرت دے دی حالانکہ اس کی صحت کے حق میں کسی کی دلیل بھی باوجود تلاش نہیں ملتی۔ مسلمانوں میں علماء قصوں کے ہمیشہ مخالف رہے ہیں۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں اگر امیر خسرو کو اس کا مصنف بنا کر اور نظام الدین اولیاء سے تبریک دلوا کر مرتب قصہ نے اس کو مقبول عام بنانے کی غرض سے دروغ مصلحت آمیز والا حیلہ تراشا ہو نیم مذہبی قصوں میں مصنفین قاری و سامع کو ثواب دارین کی بشارت اکثر دیا کرتے ہیں۔"[1]

تیسرا مضمون ملا دو پیازہ اور جعفر زٹلی کی سوانح عمریوں سے متعلق ہے۔ ان دو تاریخی شخصیتوں کے سلسلہ میں جو افسانے تراشے گئے ان سے یہ دونوں حضرات طلسم ہوشربا یا الف لیلہ کے کردار بن کر رہ گئے ہیں۔ ان کے حالات کسی نامعلوم شخص نے سیکولیر یا محمد کامل کے فرضی نام سے مرتب کئے۔ ملا دو پیازہ کو طائف کا باشندہ بتایا اور جعفر زٹلی اور اس کے اجداد کے بارے میں بھی بے سر و پا قصے بیان کئے شیرانی صاحب نے دو پیازہ کو ہندی الاصل قرار دیا۔ اُس کا نام عبد المومن اور عرف دو پیازہ بتایا۔ انہوں نے یہ بھی انکشاف کیا کہ اس کی صلاحیتوں کی وجہ سے سلاطین اور امراء تک اس کی عزت و توقیر کرتے تھے۔ وہ اپنے زمانہ میں اتنا ہر دلعزیز تھا کہ حسین خاں شاملو اور خانخاناں تک اس کی باتوں کا برا نہ مانتے تھے۔ دنیا اُس کے لطائف و نکات سننے کی شائق تھی۔ اس کی مدح و ہجو مشہور تھی۔ اُس کا انتقال عہد جہانگیری میں ۱۰۳۰ھ ۱۶۲۰ء میں ہوا۔

جعفر زٹلی کے بارے میں جو باتیں مشہور تھیں شیرانی صاحب نے ان سب کو رد کیا۔ اور فہرست مخطوطات ہندوستانی انڈیا آفس اور اردو شعراء کے کئی تذکروں کی سند پر انھوں نے جعفر زٹلی کو نارنول کا باشندہ اور قوم کا سید بتایا ہے۔ اور لکھا ہے کہ وہ ہجویہ اشعار لکھ کر

[1] مقالات شیرانی (کتاب منزل لاہور) بار اول ۱۹۴۰ء صفحہ ۵۸

اور امرا اور رؤسا سے رقمیں وصول کرکے گزر بسر کرتا تھا۔

شیرانی صاحب کا قابل ذکر مقالہ "ایران کا زندہ جاوید شاعر فردوسی" ہے۔ اس مقالہ نے تاریخی واقعات کو افسانوں کے دھند سے نکال کر اس طرح پیش کیا کہ محمود غزنوی، اور فردوسی کی شخصیتیں نکھر کر سامنے آگئیں۔ یہ واقعہ شہرت پاکر تاریخ کی درسی کتابوں تک میں داخل ہوگیا تھا کہ شاہنامہ محمود کے ایما سے لکھا گیا۔ فردوسی نے تیس سال کی محنت شاقہ کے بعد ساٹھ ہزار اشعار لکھے۔ محمود نے ہر شعر پر ایک اشرفی دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن جب ساٹھ ہزار اشرفیاں جاتی دیکھیں تو اپنے وعدہ سے پھر گیا۔ اور ساٹھ ہزار روپے دینے لگا۔ فردوسی نے لینے سے انکار کر دیا۔ اور محمود کی ہجو کہہ ڈالی۔ اس پر محمود نے اس کی گرفتاری کے احکام جاری کر دیئے۔ فردوسی ادھر اُدھر بھاگتا پھرا۔ آخر کار اپنے وطن طوس میں جاکر مرگیا۔ محمود کو بعد میں اپنے طرز عمل پر پشیمانی ہوئی۔ چنانچہ اس نے اپنے آدمیوں کے ہاتھ ساٹھ ہزار اشرفیاں بھیجیں۔ لیکن جس وقت یہ لوگ اشرفیاں لے کر شہر کے ایک دروازہ سے داخل ہوئے اسی وقت دوسرے دروازہ سے فردوسی کا جنازہ نکل رہا تھا۔ اس کی لڑکی نے اشرفیاں لے کر اپنے متوفی باپ کی ایک دیرینہ خواہش کو پورا کیا اور اس کثیر رقم سے طوس کی آبادی کے لئے ایک نہر بنوادی جس سے وہاں کے باشندے صدیوں تک سیراب ہوتے رہے۔

یہ افسانہ جتنا مشہور اور دلچسپ ہے اتنا ہی بے بنیاد ہے۔ شیرانی صاحب نے ان روایتوں کے بخئے ادھیڑ کر رکھ دیئے ہیں انھوں نے نہایت وثوق سے بتایا کہ شاہنامہ فردوسی نے محمود کے دربار میں پہنچنے سے بہت پہلے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اور اس کی تحریک فردوسی کی بیوی کی جانب سے ہوئی تھی۔ جب فردوسی اپنے وطن سے غزنیں پہنچا تو وہ اس طویل نظم کا بہت سا حصہ مکمل کر چکا تھا۔ باقی اشعار اس نے غزنیں میں بیٹھ کر کہے اور جب پوری نظم لکھ چکا تو بہت بڑے صلہ کی امید میں اس نے اپنی زندگی کا یہ بیش بہا سرمایہ محمود کی خدمت میں پیش کیا۔ محمود نے صلہ دیا لیکن فردوسی کی توقعات سے کم۔ اس بات کا اس کو رنج ضرور ہوا لیکن ہجو نہیں لکھی اور ہجو لکھنے کا اس کو کوئی حق بھی نہیں تھا۔ اس لئے کہ نہ شاہنامہ محمود کی فرمائش پر لکھا گیا اور نہ اس نے انعام کا وعدہ کیا تھا۔ شیرانی صاحب کی تحقیق کے بموجب ہجو کے زیادہ سے زیادہ تین اشعار فردوسی کے لکھے ہوئے ہیں باقی محمود کے مخالفین نے خود لکھ کر شاہنامہ کے بعد کے نسخوں میں شامل کر دیئے ہیں۔ شیرانی صاحب کا یہ بھی کہنا ہے کہ اگر فردوسی نے ہجو کے تین اشعار کہے بھی ہیں تو اس کے مقابلہ میں سلطان کی مدح میں جو کچھ کہا ہے وہ ان اشعار سے کہیں زیادہ وزنی اور گرانقدر ہے۔

"مثنوی لیلیٰ مجنوں" پر اردو کے کئی شعرا نے طبع آزمائی کی ہے۔ چنانچہ بقول پروفیسر شیرانی "گارساں دتاسی نے پانچ لیلےٰ مجنوں کا ذکر کیا ہے۔" لیکن شیرانی صاحب کے مقالہ میں جس مثنوی "لیلےٰ مجنوں" پر گفتگو کی گئی ہے وہ گارساں دتاسی کی بیان کردہ پانچ مثنویوں سے مختلف ہے۔ شیرانی صاحب کا کہنا ہے کہ "یہ مثنوی اس دور کی یادگار ہے جب اردو زبان اپنا گہوارہ چھوڑ کر گھٹنوں چلنے کی کوشش کر رہی تھی۔" "یہ دور وہ تھا جب گولکنڈہ کے تخت پر محمد قلی قطب شاہ متمکن تھا۔ شیرانی صاحب نے مثنوی کے ایک ناقص نسخے کا گہری نظر سے مطالعہ کرکے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس کا مصنف کوئی غیر معروف شاعر احمد ہے جو بقول ان کے "اس ابتدائی دور میں خاصہ جبار قادر الکلامی کا ثبوت دے رہا ہے۔" یہ مثنوی اس قدر نایاب تھی کہ گارساں دتاسی کے علاوہ بھی کسی تذکرہ میں اس کا سراغ نہیں ملتا۔ شیرانی صاحب کے ذوق تحقیق و تجسس نے اس کو کنج خمول سے نکالا۔ اور لوگوں کو اس کی گوناگوں خوبیوں سے آگاہ کیا۔

حالی اور مسدس حالی پر مقالہ مختصر اور نہایت ہلکا پھلکا ہے۔ اس کے باوجود شیرانی صاحب نے اس میں بھی تحقیق کا ایک گوشہ

تلاش کر لیا ہے۔ انہوں نے مسدس کے ان اشعار کا ماخذ جامی کے اشعار کو اور حالی کے اشعار کا ماخذ شاہنامۂ فردوسی کو قرار دیا ہے۔

کسی نے یہ ایک مرد دانا سے پوچھا — کہ نعمت ہے دنیا میں سب سے بڑی کیا

دیوان خواجہ معین الدین اجمیریؒ پر مقالہ بھی شیرانی صاحب کی تحقیق کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ صدیوں کے اس عقیدہ کو متزلزل کر دیا کہ "خواجہ اجمیری فارسی زبان کے ایک بلند پایہ شاعر تھے اور انہوں نے اپنا دیوان مرتب کیا تھا"۔ شیرانی صاحب ہی کا کام تھا۔ انہوں نے دیوان کے مرتب اور ناشر کے اس دعوےٰ کی تردید میں متعدد دلائل پیش کئے ہیں۔ کہ خواجہ اجمیریؒ مذاق شعر و شاعری رکھتے تھے اور یہ کہ جو دیوان ان کے نام سے چھپ رہا ہے۔ وہ اُن ہی کے کلام کا مجموعہ ہے۔ بلکہ انہوں نے بتایا ہے کہ یہ مولانا معین الدین فراہی کا عارفانہ کلام ہے۔ اور دیوان کے خارجی اور داخلی شواہد اس دعوےٰ کی پوری طرح تائید کرتے ہیں۔ شیرانی صاحب نے اس موضوع پر جو بحث کی ہے وہ پُرلطف ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت معلوماتی ہے۔

"فارسی شاعری" پر شیرانی صاحب کا جو مقالہ ہے اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ "بہت سے ادیب اور مصنف اس کی قدامت کے قائل ہیں اور اس کی ابتدا اوستا کے دور اور عہد ساسانی سے کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جب ایران سلطنت اسلامیہ کا ایک حصہ بن گیا تو مسلمانوں نے شاعری اور فنون لطیفہ کی مخالفت میں قدیم فارسی شاعری کا تمام سرمایہ تباہ کر دیا۔ پھر سامانی دور میں اس کا احیا ہوا"۔ شیرانی صاحب نے نہایت قطعیت کے ساتھ اس دعوےٰ کو باطل قرار دیا۔ اور دلائل قویہ سے یہ ثابت کر دیا کہ مسلمان کبھی بھی شاعری کے دشمن نہیں رہے۔ چنانچہ عربی شاعری عہد رسالت تک میں بھی رائج رہی۔ ایسی صورت میں مسلمان فارسی شاعری کی کیسے مخالفت کرتے۔ شیرانی صاحب نے فخری کی یہ شہادت پیش کی ہے۔ کہ پہلوی میں شاعری کا وجود نہیں تھا۔ پھر محمد عوفی کے اس اعتراف کو دہرایا ہے کہ شاعری ایرانیوں نے عربوں سے سیکھی۔ خود شیرانی صاحب نے تاریخی ماخذوں کی مدد سے یہ بات ثابت کی ہے کہ فارسی شاعری کی ابتدا مسلمانوں نے کی اور اس کی داغ بیل حضرت معاویہؓ اور یزید بن معاویہ کے زمانہ ہی میں پڑ چکی تھی۔ رفتہ رفتہ اس میں پختگی پیدا ہوئی اور رودکی تک پہنچتے پہنچتے اس میں اس قدر نکھار پیدا ہو گیا کہ اس نے نہایت بلند آہنگی سے اس میں یہ نغمہ الاپا۔ ع بوئے جوئے مولیاں آید ہمی الخ۔ غرض فارسی شاعری کی قدامت کے نظریہ کی تردید میں شیرانی صاحب نے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ لیکن آخر میں مقالہ کو اس طرح ختم کیا ہے کہ پڑھنے والے کو تشنگی کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔

آخری مقالہ میں شیرانی صاحب نے میر قدرت اللہ قاسم اور ان کی تالیف مجموعۂ نغز پر تفصیلی بحث کرنے کے بعد یہ انکشاف کیا ہے کہ آب حیات مولفہ محمد حسین آزاد کا اہم ماخذ مجموعہ نغز ہے اور آب حیات کی متعدد روایات جو محمد حسین آزاد کی اولیات میں شمار کی جاتی رہی ہیں ان کی اصل ہمیں مجموعۂ نغز میں ملتی ہے۔ سچ پوچھئے تو آزاد نے اپنی تالیف کے لئے اکثر مواد مجموعۂ نغز سے حاصل کیا ہے۔ لہٰذا اگر ان کے بیاں کوئی خوبی پیدا ہوئی ہے تو اس کے لئے بھی وہ عموماً قدرت اللہ خاں قاسم کے مرہون احسان ہیں اور اگر خامی ہے تو اس کی ذمہ داری بھی قدرت اللہ خاں قاسم پر ہے۔ تاہم آزاد نے ان پھولوں اور کانٹوں کو جس انداز سے ترتیب دیا اور پیش کیا ہے وہ ان کے کمالات میں شمار کئے جانے کے قابل ہے۔

مقالات شیرانی کی اس جلد میں تحقیق کا جو انداز سطور بالا میں دکھایا گیا ہے۔ وہی ان کے باقی مقالات میں بھی ہے۔ اس سرسری سے جائزہ سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ قدرت نے ان کو تحقیق کا مادہ وافر مقدار میں عطا کیا تھا۔ ان کا دریائے تحقیق ہر جگہ ٹھاٹھیں

مارتا دکھائی دیتا ہے۔ اور اس کی رو ہر قسم کی روایات، معتقدات اور دعادی کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جاتی ہے۔

نامناسب نہ ہوگا اگر اس موقع پر ڈاکٹر عبادت بریلوی کی رائے بھی پیش کردی جائے۔ وہ فرماتے ہیں۔

"حافظ محمود شیرانی بھی بہت بڑے محقق ہیں۔ تحقیق و تدقیق گویا ان کی گھٹی میں پڑی ہے اسی وجہ سے ان کی تحریروں میں تحقیق کی طرف توجہ زیادہ ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کی تنقید پس منظر میں جا پڑتی ہے۔ ان کی تحقیقی تحریروں میں کہیں کہیں تنقیدی اشارے ضرور مل جاتے ہیں۔ لیکن وہ تنقید کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کرتے۔"[۵]

۵۔ اردو تنقید کا ارتقا۔ صفحہ ۲۶۲۔ اشاعت ثانی سنہ ۱۹۶۱ء

اردو کی پہلی تصنیف

مثنوی کدم راؤ پدم راؤ

یہ مثنوی جو نظام دکنی نے تقریباً پونے چھ سو برس پہلے نظم کی تھی۔ اس کا صرف ایک نسخہ انجمن ترقی اردو پاکستان کے کتب خانہ خاص میں موجود تھا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے بڑی محنت و کاوش سے مرتب کی ہے۔ اس کے شروع میں پچاس صفحات کا سیر حاصل مقدمہ ہے جس میں فاضل مرتب نے مثنوی کی زبان کے تمام پہلوؤں کو اس انداز سے اجاگر کیا ہے کہ تحقیق کرنے والوں کو اردو کی ارتقائی منازل متعین کرنے میں صحیح مدد مل سکتی ہے۔

مثنوی اگرچہ خطِ نستعلیق میں طبع ہوئی ہے لیکن متن کا عکس اس کے مقابل دے دیا گیا ہے جس سے مخطوطے پڑھنے والے کی محنت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

کاغذ عمدہ، سفید، چکنا اور جلد خوبصورت ہے۔ اردو کے قدیم کا یہ شاہکار ملک کی ہر لائبریری میں رکھنے کے قابل ہے۔

قیمت : مجلد پچیس روپے

خاص ایڈیشن : پچاس روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان

بابائے اردو روڈ کراچی نمبر ۱

افسانہ نگار اور اخلاقی پابندی

احمد خان خلیل

زیرِ بحث موضوع میں اخلاق کی اصطلاح ایک خاص سیاق و سباق میں استعمال ہوئی ہے مثال کے طور پر ایک افسانے میں ایک نوجوان جوڑے کی شادی کا خوشیوں بھرا منظر پیش کرکے یہ تاثر دیا گیا کہ یہ جوڑا امن چین کی بھرپور زندگی گزارے گا۔ لیکن شادی کے فوراً بعد وہ نوجوان جوڑا طیارے کے ایک نہایت ہی المناک حادثے کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کا واقعہ اگرچہ ممکن ہے لیکن اس کے وقوع کی شرح ایک کروڑ شادیوں میں صرف ایک ہو سکتی ہے۔ لہٰذا کیا افسانہ نگار اخلاقی طور پر حق بہ جانب ہے کہ ایک شاذ صورتِ حال کو عام صورتِ حال بنا کر قاریوں کو زندگی اور اس کی خوشیوں سے متنفر کرے، ان کے عزائم کو توڑنے کی کوشش کرے۔ یا دوسرے لفظوں میں وہ فنی ضرورت کے مطابق ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کے لیے غیر صحت مند موڑ پیش کرے۔

اس مسئلے کی مزید وضاحت کے لیے دو ایک مثالیں اور پیش کی جاتی ہیں۔ کالج کا ایک نوجوان طالب علم اور ایک نوجوان طالبہ میں اُنس پیدا ہو جاتا ہے۔ نوجوان لڑکا غریب خاندان کا ہے۔ لڑکی امیر خاندان کی۔ بالآخر ان کی مفاہمت اتنی بڑھ جاتی ہے کہ شادی ہو جاتی ہے ہوتا یہ ہے کہ شبِ زفاف کی اگلی صبح وہ لڑکی یہ کہہ کر اپنے گھر چل دیتی ہے کہ میں افلاس کی اس سطح پر زندگی بسر نہیں کر سکتی۔

اس کہانی میں بھی واقعہ ممکن تو ہے مگر شاذ ہے۔ محبت نے امارت کے سامنے دم توڑ دیا ہے۔ امیرانہ ذہنیت کی خبر لینے کی کوشش میں ایک مصنوعی اور دردناک موڑ پیدا کیا گیا ہے۔ کیا پاکستان میں شادیاں ایسے ہی بغیر سوچے سمجھے ہوتی ہیں۔ کیا تعلیم یافتہ نوجوان نسل حقائق کے سمجھنے میں اس قدر کوری ہے۔ کیا مرد کے مقابلے میں عورت اس قدر شوخ ہو گئی ہے کہ وہ پہلے ہی دن خاوند کو خیرباد کہہ دیتی ہے اور آخر میں ــــــ مسئلہ افسانہ نگار کی اخلاقی پابندی کا ہے۔ اس نے یہ کہانی پیش کرکے اخلاق کے تقاضے پورے کیے ہیں یا نہیں؟

یہاں یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ میں اردو افسانہ نگاری کی حرف گیری کر رہا ہوں۔ اگر واقعی یہ عیب ہے تو یہ عیب دنیا کی ہر زبان کے افسانوں میں موجود ہے بلکہ کبھی کبھی ایسا خام افسانہ دنیا کے بہترین افسانہ نگاروں کے قلم سے بھی نکل گیا ہے۔

مثلاً موپساں کی ایک شہرۂ آفاق کہانی "ہار" کو لیجیے۔ اس کا شمار دنیا کی مختصر ترین بہترین کہانیوں میں ہوتا ہے۔ ایک خاتون کسی تقریب میں شمولیت کے لیے اپنی ایک سہیلی کا موتیوں والا ہار ادھار مانگتی ہے بدقسمتی سے وہ ہار کھو جاتا ہے۔ وہ خاتون اور اس کا خاوند قرض لے کر ایک نیا ہار اس خاتون کو خرید کر دیتے ہیں، جس سے انھوں نے عاریتہً لیا تھا۔ پھر دس برس تک محنت مشقت کرتے رہے۔ فاقے کاٹتے رہے یہاں تک بڑھاپا ان پر چھانے لگا تب جا کر وہ قرض چکا لیکن اب جبکہ یہ بات سہیلی نے سنی تو اس نے کہا "وہ ہار تو نقلی تھا۔"

اس عظیم افسانے میں بھی عظیم اخلاقی خامیاں موجود ہیں۔ کیا افسانہ لکھتے وقت جناب موپساں نے فرض کر لیا تھا کہ دنیا میں انسانیت کا وجود نہیں رہا۔ ادھار دالی سہیلی نے یہ کیوں نہ بتایا کہ ہار نقلی ہے۔ لینے والی نری بدھو ثابت ہوتی ہے اور پھر آخر میں اتنی دردناک کہانی سننے پر صرف یہ کہنا "وہ ہار تو نقلی تھا" بے حسی کی انتہا ہے۔ ممکن ہے ایسے بے درد لوگ اس بے درد دنیا میں موجود ہوں لیکن موپساں نے محض فنی مہارت سے یہ سب کچھ ممکن کر دکھایا۔ (کہا جاتا ہے کہ اس نے یہ غلطی دوبارہ نہیں کی)۔

غالباً فرانسیسی ہی کی ایک اور رومانوی (بعید از قیاس) کہانی یہ بھی ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کے پاس کسی غیر مرد کے لکھے ہوئے عاشقانہ خطوط کا پلندہ دیکھا اور آتش غضب میں اس کا گلا گھونٹ ڈالا۔ یہ خطوط اس بیچاری کی ایک سہیلی کے تھے اور امانت پڑے تھے۔ مرتے وقت اس بدبخت کی آنکھ سے ایک آنسو قاتل خاوند کی کلائی پر گرا۔ تب سے ہر سال عین اسی مقام پر ایک زبردست جلن اور ٹیس اٹھتی ہے اور قاتل خاوند کو ہر سال وہاں نشتر لگوانا پڑتا ہے۔ یہ واقعہ اس خاوند نے ڈاکٹر کو نشتر لگواتے وقت سنایا۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ واقعہ کس دنیا کا ہے کہ جس میں نہ کوئی قانون ہے اور نہ روک ٹوک۔ خاوند بیوی کا گلا دبا کر جان سے مار دیتا ہے اور سال بہ سال یہ واقعہ سنا کر نشتر لگواتا ہے۔ افسانہ نگار نے اس بھیانک قتل کی ایک عجیب و غریب سزا تجویز کی ہے کہ اس کی کلائی میں ہر سال ٹیس اٹھا کرے گی۔ کیا خوب!

یہ دو واقعات ثابت کرتے ہیں کہ روئے سخن فقط اردو افسانہ کی طرف نہیں بلکہ دنیا بھر کے افسانوں اور افسانہ نگاروں کو ایک اہم مسئلے کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اگر ہم اور آپ کوئی غلط بیان دیں تو قانوناً دھر لیے جاتے ہیں۔ غلط حقائق لکھیں تو نقری اور کاذب کہلاتے ہیں۔ جعلی اور فرضی باتوں سے فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کریں تو چار سو بیس ٹھہرتے ہیں لیکن افسانے میں جی بھر کر جھوٹ بولنے، غلط بیانی کرنے، حقیقت کی جھوٹ سے آمیزش کرنے سے ادیب سمجھے جاتے ہیں، شہرت پاتے ہیں۔

یہاں مسئلہ فقط یہ نہیں کہ ایک واقعہ کو عام واقعہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے یا حقائق کو ڈرامے کی فنی ضروریات کے تحت لا کر ایک غیر حقیقی تاثر دیا جاتا ہے۔ بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس قسم کا تاثر غلط رویے کی تربیت کا باعث بن کر غیر صحت مند انسان پیدا کرتا ہے۔ جوانی کی خوشی سے نفرت، زندگی سے نفرت، معاشرے کے کسی طبقے سے نفرت، حوصلہ شکنی، بے اعتمادی، موت کی تمنا ـــــ یہ سب احساسات افسانوں سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ ان کا ذمہ دار کون ہے؟

یہاں تک دلائل یک طرفہ تھے، وہ بیچارہ افسانہ نگار کٹہرے میں کھڑا رہا۔ اسے بھی تو اپنے دفاع کا حق حاصل ہے۔

جیسا کہ یہاں یہ الزام لگایا گیا ہے کہ افسانہ نگار انسان کی نفسیاتی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ افسانہ نگار بھی کہہ سکتا ہے۔

اگر یہ استحصال ہے تو اس قسم کا استحصال دنیا کے ہر معاشرے کی ہر سطح پر ہر فرد کرتا آیا ہے۔ مثلاً جب مویشی یا کوئی پالتو جانور دور بھاگ جاتا ہے تو ہم اسے گھاس یا چارا دکھا کر پکڑتے ہیں۔ اپنے بچوں کو ہم فرضی اور جھوٹ موٹ کے قصے سناتے ہیں۔ جھوٹ موٹ کے ہوّے سے ڈراتے ہیں۔ ظاہرداری قائم رکھنے کو ہم سب ایسی وضع قطع اختیار کرتے ہیں کہ دوسروں کو دھوکا ہو۔ کیا دنیا بھر کی اشتہار بازی، کسی موقف کے حق میں یا اس کے خلاف دلائل اسی نفسیاتی عمل کا نتیجہ نہیں۔ کیا ہمارے کلاسیکل ادب: پریوں

کے قصے، الف لیلیٰ، امیر حمزہ کی داستان جیسی تحریریں انھی خامیوں سے معمور نہیں۔

افسانہ نگار یہ بھی تو کہہ سکتا ہے کہ ہم جو کچھ لکھتے ہیں وہ خلاقِ دنیا کے لیے نہیں لکھتے۔ ادبی ذوق کی تسکین کے علاوہ اقتصادی لحاظ سے افسانہ ایک ایسی ہی شے ہے جیسی کہ دنیا کی دوسری اشیا جس قسم کی اشیا کی طلب ہوتی ہے ویسی ہی بن کر منڈی میں آتی ہیں۔ اگر افسانہ نگار کا مال کھرا نہیں تو اس کی مانگ بند کر دی جائے۔ دوسرے لفظوں میں اسے یوں بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ جن الزامات اور خامیوں کی نشاندہی کی گئی ہے ان کا اطلاق قاریوں پر بھی ہوتا ہے۔

غرض اس بحث کے مختلف زاویوں پر غور کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے کو قانونی شکل دینے سے مسئلہ حل ہونے کے بجائے پیچیدہ ہو جائے گا۔ بہتر یہی ہے کہ اسے اس کی ادبی حدود ہی کے اندر رکھ کر غور کیا جائے۔

یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ کیا ادب عالیہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ایسے سنسنی خیز موڑ دیئے جائیں۔

دنیا کے کسی بہترین ادب کا یہ تقاضا نہیں۔ ادب صرف ایک بات کا متقاضی ہے کہ حقیقت کا دامن نہ چھوڑا جائے۔

کیا فنِ افسانہ نگاری اس بات کا متقاضی ہے کہ پلاٹ میں سنسنی خیز موڑ دیا جائے۔

بطور اصول و قواعد ایسی کوئی پابندی نہیں۔ دنیا کی بعض بہترین کہانیاں ایسی ہیں جن کے پلاٹ ایسے سادہ ہیں کہ نوآموز افسانہ نگاروں کی نظر میں وہ پلاٹ ہی نہیں ہو سکتے۔ مثال کے طور پر آپ چیخوف کی کہانی "استانی" کو لیجیے۔ ماسکو کی رہنے والی ایک خاتون ماسکو سے دُور ایک اسکول میں دس بارہ برس سے استانی کے طور پر تعینات ہے۔ ایک بار وہ تنخواہ لینے ماسکو جاتی ہے تو راستے میں اس کی جان پہچان کا ایک خوش رو، خوش پوش مرد سواری میں اس کا ساتھی بن جاتا ہے۔ نہایت مختصر عرصے کے لیے وہ ایک ساتھ سفر کرتے ہیں اور بالکل رسمی باتیں ہوتی ہیں۔ پھر وہ جوان اپنی راہ لیتا ہے۔ اگر اس کہانی کا کوئی پلاٹ ہو سکتا ہے تو یہی ہے۔ آپ کہیں گے یہ کیا بکواس ہے لیکن اس مختصر سفر میں چیخوف نے اس استانی اور اس نوجوان مرد کی گزشتہ زندگی کی چند جھلکیاں دکھا کر کہانی میں گہرائی اور معنویت پیدا کی ہے۔ استانی ماسکو شہر کی رنگینیوں سے دُور ایک گاؤں میں زندگی کی بے کیفی کی شاکی ہے۔ نوجوان اپنی ازدواجی زندگی میں بے اطمینانی سے مضطرب ہے۔ گھوڑا گاڑی (یا جو سواری بھی وہ تھی جواب مجھے ٹھیک یاد نہیں) زندگی کے سفر کی علامت ہے جس میں ہر مسافر کسی نہ کسی مسئلے سے دوچار ہے۔ یہاں یہ ضرور کہنا چاہیے کہ ایسی کہانیاں قاری کے تخیل اور ذہانت کا تقاضا ضرور کرتی ہیں۔

کیا ایسی کہانیاں صرف ٹالسٹائی اور چیخوف ہی لکھتے تھے؟ نہیں تو۔ ہمارے ہاں بھی ہیں۔ منشی پریم چند کی ایک کہانی "نادان دوست" ملاحظہ ہو۔ (غالباً یہ بجا طور پر انٹرمیڈیٹ کے اردو کورس میں بھی موجود ہے)۔ دو چھوٹے بچوں کو چڑیا کے ایک گھونسلے اور اس کے انڈوں کا علم ہو جاتا ہے۔ وہ از راہ ہمدردی اس گھونسلے کو محفوظ کرنے کے لیے چوری چوری چند اقدامات کرتے ہیں۔ آخر اُن کی اس معصوم چھیڑ چھاڑ سے گھونسلا گر پڑتا ہے۔ انڈے ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور چڑیا اس تشدد کو برداشت نہ کر کے گھر چھوڑ دیتی ہے۔ کتنی سادہ سی بات میں کتنی بڑی حقیقت بیان کر دی ہے۔

تسکین
ریڈ اینڈ وھائٹ
فلٹر
satisfaction
Red & White
FILTER
Marcovitch
Red & White
FILTER TIPPED
FILTER TIPPED
AP-AYT

تاریخِ پسرور

ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین

پسرور ضلع سیالکوٹ کا ایک مردم خیز قصبہ ہے جو سیالکوٹ نارووال ریلوے لائین کے وسط میں واقع ہے۔ پسرور کا قدیم ترین نام پُرسرور ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ مغل بادشاہ بابر نے ابراہیم لودھی سے پانی پت کے میدان میں نبرد آزما ہونے سے قبل پُرسرور کے مقام پر قیام کیا تھا۔ یہاں لاہور کے سردار عسکری طاقت لے کر اپنے بادشاہ سے آکر ملے۔ بابر نے اپنی خودنوشت سوانح "تزک بابری" میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اس حوالے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ۱۵۲۵ء (۹۳۲ھ) میں اس کا نام پُرسرور تھا

بابر سے قبل اس قصبہ کا نام کیا تھا؟ وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا زیب داستان کے لیے چند مخصوص ناموں سے اسے منسوب کیا جاتا ہے۔ جنہیں اگر تحقیق کی کسوٹی پر پرکھیں تو یہ سب نام غلط ثابت ہوتے ہیں۔ مثلاً منشی امین چند اپنی کتاب تاریخ سیالکوٹ (مطبوعہ۔ لاہور۔ ۱۸۷۷ء) میں ذکر کرتا ہے کہ بابر نے میکا پسر بندو نامی ہندو کو پسرور بطور جاگیر عطا کیا تھا۔ میکا نے مرتے وقت پسرور کو اپنے گرو پرس رام کی تحویل میں دے دیا۔ اس نسبت سے اس کا نام پرس دور ہوا جو بعد میں پسرور ہو گیا۔ ڈسٹرکٹ گزیٹیر میں مرقوم ہے کہ باجوہ جٹ کے بانی کھولو کے چھ لڑکے تھے۔ جنہوں نے بیگووال، رڑکی، مکھنووالی، چونڈہ، نارووال اور پسرور آباد کیے۔ منکہ نامی لڑکے نے پسرور آباد کیا۔ اس کے بعد یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ ہمایوں پسرور میں مدفون بزرگ سید جلال شاہ بخاری کے مزار پر دو بار حاضر ہوا پہلی بار فقیری حالت میں جبکہ منکہ نامی شخص اسے ایک روپیہ بطور نذرانہ پیش کرتا ہے۔ دوسری بار ایک بادشاہ کے روپ میں اس بار ہمایوں نے منکہ کو بلوا کر پرگنہ پسرور اسے بطور جاگیر دے دیا۔ سیالکوٹ کے بدالصمد غلام محمد نے تواریخ سیالکوٹ کے نام سے ۱۴۸ صفحات پر مشتمل ایک یادداشتوں کا مجموعہ مرتب کیا ہے جو ۱۸۹۷ء میں سیالکوٹ سے شائع ہوا اس میں پہلی بار بغیر کسی حوالے اور شہادت کے بتایا گیا ہے کہ پسرور کا نام جگت پور تھا۔ سیالکوٹ کے راجہ سہن پال کا بھائی جگت پال اس قصبے کا حکمران تھا اس کے نام کی نسبت سے اسے جگت پور کہا جاتا تھا۔ سیالکوٹ کے امام سید علی الحق کی جگت پور کے مقام پر راجہ جگت پال سے جنگ ہوئی۔ مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔ امام صاحب کے چھوٹے بھائی سید میر باز خاں المعروف میراں برخوردار اور بہت سے سرکردہ لیڈر شہید ہو گئے ان سب کو یہاں دفن کر دیا۔

امام سید علی الحق اور پسرور میں مدفون اُن کے بھائی امام میراں برخوردار کے حالات زندگی پردۂ راز میں ہیں۔ ابھی تک تو ان کے دور کا بھی صحیح طور پر تعین نہیں ہو سکا اس لیے ہم امام میراں برخوردار کی شہادت کا سال بھی متعین نہیں کر سکتے بہر حال یہ تصدیق شدہ امر ہے کہ بابر کے دور میں اور اس سے قبل اس کا نام پُرسرور تھا۔ یہ نام سکھ عہد میں بھی رہا۔ انگریزی عہد کے ابتدائی

سالوں میں بھی یہی نام دیا۔ پسرور کے ایک دو گھرانوں میں اس دور کی خاندانی عام دستاویزات موجود ہیں۔ ان سب سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ ۱۸۴۷ء اور ۱۸۵۵ء کے درمیانی عرصہ میں یہ نام پسرور میں تبدیل ہو گیا تھا۔

پسرور کی قدامت کے متعلق صحیح طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ مغل متاخرین کے دور میں محمد اسلم بن محمد حفیظ اللہ انصاری پسروری نے ۱۱۸۴ھ بمطابق ۱۷۷۰-۷۱ء میں فرحت الناظرین نامی ایک کتاب مرتب کی ہے۔ اس میں وہ اپنے آبائی شہر پسرور کے متعلق نشاندہی کرتا ہے کہ یہ قدیم شہر ایک ہزار سال قبل معرض وجود میں آیا اور بعض روایات کے مطابق اس شہر کی تعمیر راجا آنند پال کے زمانہ میں ہوئی۔ قیاس یہی ہے کہ پسرور قبل از مسیح عہد سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ گیارہویں صدی عیسوی کی ابتدا میں یہ قصبہ آباد ہوا۔

تاریخ کی ورق گردانی کریں تو سب سے پہلے مغل حکومت کے بانی ظہیر الدین بابر کے حملوں کے سلسلوں میں پسرور کا ذکر ملتا ہے بابر پانچویں بار ۹۳۵ھ میں ہندوستان پر فیصلہ کن حملہ کرنے کے بعد جب جہلم میں فروکش ہوا تو اس نے اپنے دو جرنیلوں سید طوفان اور سید لاچین کو تیز رفتار گھوڑوں کا ایک ایک جوڑا دے کر لاہور کے پاس بھیجا کہ وہ اسے سیالکوٹ یا پرسرور میں ملیں۔ بابر سیالکوٹ میں چند روز قیام کرنے کے بعد پرسرور پہنچتا ہے۔ یہاں ایک شب قیام کرتا ہے۔ محمد علی خنگ جنگ لاہور کے دیوان خواجہ حسین اور لاہور سے آتے ہوئے دوسرے سردار بابر کی خدمت میں پیش ہوتے۔ بابر ان سب ساتھیوں کی معیت میں کلانور پہنچا۔ اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بابر کے دور میں یا اس سے قبل بیرونی حملہ آوروں کے لیے دہلی جاتے ہوئے پرسرور "آرام گاہ" کا کام دیا کرتا تھا۔ بابر کے پیغام سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ اس سے قبل پسرور کو جانتا تھا اور یہاں وہ ٹھہر بھی چکا تھا۔

۹۳۰ھ میں کلانور کا قلعہ محمد علی خنگ جنگ کے تحت تھا۔ غازی خاں نے وعدے کی پاسداری نہ کی اور کلانور پر حملہ کر دیا۔ محمد علی اس حملے کی تاب نہ لا سکا اور بھاگ کر لاہور میں پناہ گزین ہوا۔ غازی خاں نے کلانور پر قبضہ کر لیا اور خود پرسرور میں ٹھہرا۔ لیکن جب غازی خاں کو بابر کی فوجوں کے آنے کی اطلاع ملی تو وہ ملوٹ کی طرف بھاگ گیا۔

بابر کے بعد دوسرا مغل بادشاہ ہمایوں پسرور میں دو بار آتا ہے۔ ۱۵۴۰ء میں قنوج کی جنگ میں ہمایوں شیر شاہ سوری سے شکست کھانے کے بعد کشمیر جانے کی کوشش کرتا ہے۔ کشمیر کی طرف جاتے ہوئے فقیرانہ حالت میں پرسرور شہر میں سید جلال شاہ بخاری کے مزار پُر انوار پر حاضری دیتا ہے۔ اور تخت دہلی کے دوبارہ حصول کے لیے دعا مانگی۔ یہاں ہندو ساہوکار ٹھیکا نے ہمایوں کو ایک روپیہ بطور نذرانہ پیش کیا۔ ہمایوں نے یہ نذرانہ قبول نہ کیا۔ چودہ پندرہ برس بعد ہمایوں دوبارہ شہنشاہ کے روپ میں سید صاحب کے مزار پر حاضر ہوا۔ اور ٹھیکا کو بلوا کر پرگنہ پرسرور بطور جاگیر اسے دے دیا۔ اس کے بعد دو روایتیں بیان کی جاتی ہیں۔ پہلی روایت یہ ہے کہ ٹھیکا یا منگا نے مرتے وقت اپنے پروہیت یا گرو پرس رام کو یہ پرگنہ دے دیا تھا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ ٹھیکا کی وفات کے بعد اس کا بھائی فتح چند حاکم پرسرور ہوا۔ اکبر اعظم کے دور میں صوبہ لاہور آٹھ حصوں (سواروں) میں تقسیم تھا یعنی سواد لاہور۔ سرکار جالندھر۔ سرکار بٹالہ۔ پٹی حیبت پور، سرکار پرسرور سرکار رہتاس۔ سرکار سیالکوٹ۔ سرکار ہزارہ۔ اکبر اعظم نے ابتدا میں پرگنہ پرسرور فتح چند ہی کے پاس رہنے دیا بعد میں اس نے خواجہ مظفر علی المعروف مظفر خان ترتی (یا تربتی) کی تحویل میں دے دیا۔ پسرور شہر میں ایک بزرگ شاہ دین المعروف بہ شاہ این یا شاہ بین ہوئے ہیں جو سیالکوٹ کی معروف علمی شخصیت اور علامہ اقبال کے استادِ گرامی

سید میر حسن کے اجداد میں سے ہیں۔ شاہ بیتی کے والد ماجد کا نام سید محمد شاہ تھا۔ موصوف اکبری عہد میں ہوئے ہیں۔ اسی دور میں یہاں کا ایک ہندو باجوہ نواب اسلام قبول کر کے پسرور میں ایک پختہ مسجد تعمیر کرتا ہے۔ جو آج شاہی مسجد کے نام سے موسوم ہے

اکبر اعظم کے عہد حکومت میں ایک ہندو شاہی ملازم کالو مل نے پسرور میں ایک پختہ ہشت پہلو تالاب تعمیر کرایا۔ اسی دور میں پسرور غلہ کی ایک مشہور منڈی بھی تھی۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں سرکار پسرور کی فصلوں اور ان کے نرخوں کا تفصیلی ذکر کیا ہے عہد جہانگیری میں پسرور سے متعلق کوئی معلومات دستیاب نہیں ہو سکیں۔ شاہ جہاں کے دور میں گجرات کے بزرگ شاہ دولہ نے سیالکوٹ پسرور روڈ پر پسرور کے قریب ایک پل تعمیر کرایا۔ اس کے علاوہ آپ نے شہر کے شمال میں ایک تالاب بھی تعمیر کرایا جسے اُن دنوں کچا تالاب کہا جاتا ہے کالو مل کھتری کے تعمیر کردہ ہشت پہلو تالاب میں پانی لانے کے لیے شاہجہاں کے بڑے لڑکے دارا شکوہ نے ایک نہر کھدوائی جس کے ذریعے ڈیک سے تالاب میں پانی لایا گیا۔

اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں بھی ضلع سیالکوٹ پسرور سے الگ حصہ تھا۔ پسرور ایک علیحدہ پرگنہ تھا۔ پسرور کا حاکم دیوان سنکت رائے تھا۔ دیوان صاحب نے ہشت پہلو تالاب کی مرمت کرائی۔ ایک بارہ دری بھی بنوائی جو نارمل اسکول کے پاس آج بھی کھنڈر کی شکل میں موجود ہے بارہ دری کے گرد دیوان مذکور نے ایک باغ بھی لگوایا تھا۔ محمد مقیم بن شیخ رحمت اللہ موضع شہزادہ باجوہ تحصیل پسرور کا رہنے والا تھا۔ محمد مقیم عالمگیری دور حکومت میں سیالکوٹ اور پسرور کے علاقوں کا وقائع نویس (رپورٹر) تھا۔ مقیم نے وقائع سیالکوٹ ۱۰۷۱ھ بمطابق ۱۶۶۱ء میں لکھی۔ اس میں اس نے سیالکوٹ شہر میں مدفون بزرگ حضرت سید امام علی الحق کا واقعہ جہاد اور ان کی کرامات بیان کی ہیں مزید برآں اس میں ضلع سیالکوٹ کی بھی کچھ تاریخی حیثیت بیان کی گئی ہے۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی نے ۲۷ صفحات پر مشتمل اس تاریخی دستاویز کو مرتب کر کے ۱۹۷۲ء میں لاہور سے شائع کر دیا ہے۔ اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد کا زمانہ افراتفری کا زمانہ تھا جس کسی کا زور چلا اس نے کچھ علاقہ کے لیے اپنی حکومت قائم کرلی۔ ۱۷۰۷ء سے لے کر ۱۸۴۸ء تک کے دور میں پسرور پر مختلف طاقتیں حکومت کرتی رہیں۔

الف: نادر شاہ: ۱۷۳۸ء میں ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ ان دنوں مغل بادشاہ محمد شاہ (۴۸-۱۷۱۹) کی جانب سے نواب ذکریا خاں گورنر لاہور تھا۔ اسی کے تحت گجرات سیالکوٹ، پسرور، ظفروال کے علاقے تھے۔ نادر شاہ نے واپسی پر ذکریا خاں سے ایک کروڑ روپیہ مانگا جسے نواب نے لاہور کے شہریوں سے لے کر پورا کر دیا۔ اس کے علاوہ نواب نے وعدہ کیا کہ وہ ضلع گجرات، سیالکوٹ، پسرور اور خدایار خاں ملتان کی زمینداری کے کچھ اضلاع کا لگان بھی سالانہ اسے دیا کرے گا۔

ب: احمد شاہ ابدالی: ۱۷۴۸ء میں لاہور کے گورنر شاہنواز خاں نے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ ابدالی نے اسی سال موسم بہار میں پہلا حملہ کیا۔ سال کے آخر میں وہ دوبارہ حملہ آور ہوا۔ اس وقت معین الملک میر منو گورنر لاہور تھا۔ میر منو نے پسرور، گجرات، سیالکوٹ اور اورنگ آباد کا سالانہ لگان ادا کرنے کا وعدہ کر کے پیچھا چھڑایا۔ ۵۲-۱۷۵۱ء میں میر منو نے احمد شاہ ابدالی کو ان چار محال کا لگان دینا بند کر دیا۔ احمد شاہ ابدالی پھر حملہ آور ہوا۔ محمود بوٹی (نزد لاہور) کے قریب جنگ ہوئی میر منو نے دوبارہ صلح کی درخواست کی اور مذکورہ علاقے ابدالی کے سپرد کر دیے۔ ابدالی نے ان علاقوں پر ناصر خاں کو اپنا گورنر مقرر کر دیا۔ ان چار محال کے لگان سے کابل اور پشاور کے اخراجات پورے کیے جاتے تھے احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۵۹ء

کے موسم سرما میں ایک اور حملہ کیا۔ مرہٹوں کے مقرر کردہ گورنر لاہور شاماجی کو شکست دے کر لاہور پر قبضہ کر لیا اور کریم داد کو لاہور کا گورنر مقرر کر دیا۔ نواب زین خان کو گورنر چار محال (گجرات، سیالکوٹ، پسرور اور اورنگ آباد) مقرر کر کے خود دہلی کی جانب پیشقدمی کی۔ زین خان کی پسرور میں آمد کے موقعہ پر یہاں کا فارسی گو شاعر دلشاد پسروری کہتا ہے۔

یعنی بہ پسرور ز فرخندگی بخت
بازیب و زین و زینت و شان زین خان رسید
پژمردگان نشاط ز سر بر گرفتہ اند
ہنگام نوبہار بوقت خزاں رسید

احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۶۱ء میں پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو شکست دے کر ان کی طاقت کو بڑی حد تک ختم کر دیا۔ اس نے پنجاب میں مقرر کردہ گورنر کریم داد اور زین خان کو اپنے پاس بلا لیا۔ ان کی غیر حاضری میں سکھوں نے لاہور پر قبضہ کر لیا۔ سکھوں کی بغاوت فرو کرنے کی ابدالی نے بڑی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ سکھوں نے ابدالی کا دریائے سندھ تک پیچھا کیا۔ واپسی پر سکھوں کا مقابلہ خواجہ مرزا خان سے ہوا جو زین خان کے بعد چار محال (گجرات، سیالکوٹ، پسرور، اورنگ آباد) کا حاکم تھا۔

(ج) رنجیت دیو: اس نے ۱۷۴۸ء کے حملہ میں احمد شاہ ابدالی کی مدد کی تھی۔ اس لیے ابدالی نے اس کو ۱۷۵۷ء میں جموں کے علاقہ کا راجا مقرر کیا۔ ابدالی کی زندگی تک تو اس نے اس کے دوسرے علاقوں کو حریصانہ نظروں سے نہ دیکھا مگر اس کی موت کے بعد محال کو اپنی حدود میں شامل کر لیا۔ رنجیت دیو بڑا ظالم حکمران تھا۔ خصوصاً مسلمانوں پر اس نے عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ یہاں تک کہ جمعہ کی اذان دینے کی بھی ممانعت تھی۔ دلشاد پسروری اس کے متعلق کہتا ہے۔

بسکہ منع است دریں شہر اذانِ جمعہ نکند گوش کسی نالۂ بیکاران را

رنجیت دیو کے دور میں دیوان نرائن داس محلات سیالکوٹ اور پسرور کا دیوان یعنی حاکم تھا۔ اس ہندو دیوان نے پسرور کی رعایا پر عرصۂ حیات تنگ کیے رکھا۔ دلشاد پسروری نے بارہ اشعار پر مشتمل ایک محضر اس کی خدمت میں پیش کیا جس کا مطلع ہے۔

ای مبارک فال دیوان نرائن داس ما جز بہ لطف تو دریں دوران کہ وارد پاس ما

رنجیت دیو کے بعد اس کا بڑا لڑکا برج راج ۱۷۸۲ء میں گدی نشین ہوا۔ سکھوں کا ٹڈی دل لشکر آئے دن اس کے علاقے کو لوٹتا رہتا تھا۔ آخر ایک فیصلہ کن لڑائی میں برج راج مارا گیا۔ برج راج کے بعد سکھوں میں طوائف الملوکی کا دور شروع ہوا۔ ہر سردار نے چند گاؤں فتح کر کے حکمرانی شروع کر دی۔

(د) ناہر سنگھ: یہ سکھ سردار چہیاری ضلع امرتسر کا رہنے والا تھا۔ اس نے پسرور کو فتح کیا۔ ناہر سنگھ نے پسرور کو وسعت دی اور پر سکون فضا پیدا کرنے کی سعی کی۔ ناہر سنگھ ۱۸۰۷ء میں انتقال کر گیا۔ اس کی موت کے وقت اس کے لڑکے چھوٹے تھے اس لیے

(ر): رنجیت سنگھ (۱۷۸۰ - ۱۸۳۹) نے بڑی آسانی سے ۱۸۰۷ء میں پسرور اور احمد چیاری کے پرگنوں پر قبضہ کر لیا اور نابر سنگھ کے یتیم لڑکوں اور بیواؤں کی گزر اوقات کے لیے پانچ گاؤں مختص کر دیئے رنجیت سنگھ نے پرگنہ پسرور نہال سنگھ اٹاری والے سکھ سردار کو بطور جاگیر دے دیا۔ نہال سنگھ کے بعد اس کا لڑکا شام سنگھ پرگنہ پسرور کا مالیہ وصول کیا کرتا تھا۔

انگریزوں نے پسرور پر کب اور کس طرح قبضہ کیا، یہ معلوم نہیں ہو سکا مال کے ریکارڈ سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ پسرور کے ایک شخص الٰہی بخش ولد پیر بخش نے ۱۸۴۸ء میں پسرور پر قبضہ کرتے وقت انگریزوں کی معاونت اور سکھوں کی مخالفت کی تھی۔ اس کے صلے میں انگریز حکمرانوں نے اسے معافی دار قرار دیا۔ اس کے علاوہ یہ لوگ بھی معافی دار تھے۔ علی محمد ولد کرم الٰہی، قطب الدین ولد علی محمد، خادم محی الدین ولد ولی محمد، احمد بخش ولد جان الٰہی بخش کو انگریزوں نے پسرور کا نمبردار بھی مقرر کیا تھا انگریزی قبضہ سے قبل پسرور کی اپنی ایک علیحدہ حیثیت تھی۔ انگریزوں نے ۱۸۴۹-۵۰ء میں امرتسر کو ایک نیا ڈویژن بنایا جس کا صدر دفتر لاہور میں تھا۔ اس ڈویژن میں تین اضلاع سیالکوٹ، امرتسر اور گورداسپور تھے۔ پسرور ضلع سیالکوٹ کے تحت تھا، یہ سلسلہ نومبر ۱۸۸۴ء تک قائم رہا، ضلع سیالکوٹ کا بندوبست اراضی مارچ ۱۸۶۶ء میں مکمل ہوا۔ ضلع کو چار سب ڈویژن یا ذیل یعنی ظفروال، سیالکوٹ، ڈسکہ اور پسرور میں تقسیم کیا گیا۔ ہر ذیل میں ایک ذیلدار مقرر تھا لارڈ پرنسپ نے نبی بخش ولد حیات علی کو پسرور کا ذیلدار مقرر کیا۔

۱۸۶۷ء میں ڈسکہ تحصیل ختم کر دی گئی۔ اس کا کچھ حصہ تحصیل سیالکوٹ میں اور کچھ حصہ تحصیل پسرور میں شامل کر دیا گیا۔ ۱۸۸۱ء تک تحصیل ڈسکہ معطل رہی۔ ۱۸۸۱ء میں ڈسکہ تحصیل دوبارہ قائم کر دی گئی۔ اسی دوران پانچویں تحصیل رعیہ کا اضافہ ہوتا ہے دسمبر ۱۸۸۴ء میں ضلع سیالکوٹ کو راولپنڈی ڈویژن میں شامل کر دیا گیا۔ ۱۹۱۲ء میں شیخوپورہ ضلع بنا۔ رعیہ تحصیل ضلع شیخوپورہ کے تحت کر دی گئی۔ ۱۹۲۲ء میں ظفروال تحصیل توڑ کر نارووال کو تحصیل کا درجہ دے دیا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں ضلع گورداسپور کی تحصیل شکر گڑھ پاکستان میں آ گئی جسے ضلع سیالکوٹ میں مدغم کر دیا گیا۔ اس طرح اب ضلع سیالکوٹ میں پانچ تحصیلیں سیالکوٹ، ڈسکہ، پسرور، نارووال اور شکر گڑھ ہیں۔

انگریزی عہد کی ابتدا ہی سے یہاں تحصیلدار مقرر تھا۔ اسے درجہ دوم مجسٹریٹ کے اختیارات حاصل تھے۔ اس کے علاوہ ایک نائب تحصیل دار بھی تھا مگر اسے جوڈیشل اختیارات حاصل نہیں تھے۔ یکم جنوری ۱۹۷۵ء کو یہاں اسسٹنٹ کمشنر کا عہدہ قائم ہوا۔

انجمن اردو کینیڈا

سیکرٹری امیر صولت

پتہ: ۱۱- برلنگھم کرلیت۔ ڈومنیس

اونٹاریو - کینیڈا

نئے خزانے

ابوسلمان شاہجہانپوری

یہ اشاریہ مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت ترتیب دیا گیا ہے

ادب و زبان

ادب: مسائل و مباحث
اردو زبان اور اس کے مسائل
تحقیق و تنقید
خطوط و نوادر
خود نوشت
علاقائی و دیگر زبانوں کا ادب
لسانیات
تاریخ و سیاسیات

تحریکات:

تحریک اہل حدیث
تحریکات ملی
تعلیمات
تہذیب و ثقافت
خاندان
دینی تعلیمی اور دیگر ادارے
سیر و سیاحت

شخصیات:

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ
حضرت عمر فاروق رضؓ
حضرت عثمان غنی رضؓ
حضرت حسین رضؓ
دیگر صحابۂ کرام رضؓ
ابوالکلام آزاد
ابوالاعلیٰ مودودی
اقبال
حسن نظامی
شبیر احمد عثمانی
عزیز احمد
قائد اعظم
موجد۔ آرٹسٹ
یوسف حسین خان
ادبی شخصیات
بزرگانِ دین
تاریخی شخصیات

کتابیات:

مذہبیات:

سیرت انبیاء و سیرت نبوی
قرآنیات: تفسیر اور دیگر مباحث
اسلام اور علوم جدیدہ
اسلام، قانونی اور سیاسی نظام
مسائل و مباحث متفرقہ

اس اشاریے کی ترتیب میں دسمبر ۱۹۷۹ء، جنوری ۱۹۸۰ء
اور دیگر مہینوں کے مندرجہ ذیل رسائل سے مدد لی گئی ہے

ماہنامہ	ادب لطیف	لاہور	مارچ تا جون	۱۹۷۹ء
سہ ماہی	اردو	کراچی	جولائی تا اکتوبر	"
ماہنامہ	افکار	"	دسمبر ۱۹۷۹ء و جنوری ۱۹۸۰ء	
"	اکرم	"	—	۱۹۷۹ء
ماہنامہ	الانسان	"	اکتوبر ۱۹۷۹ء و جنوری ۱۹۸۰ء	
—	اورینٹل کالج میگزین	لاہور	جشن اقبال نمبر، نومبر و فروری تا مئی ۸۰ء	
ماہنامہ	برہان	دہلی	جنوری	۱۹۸۰ء
"	البلاغ	کراچی	دسمبر ۱۹۷۹ء و جنوری ۱۹۸۰ء	
"	پیام عمل	لاہور	"	"
"	ترجمان الحدیث	"	"	"
"	ترجمان القرآن	"	نومبر و دسمبر	۱۹۷۹ء
"	تعلیمات	"	اگست تا "	"
"	جامعہ	دہلی	اکتوبر	"
"	الجامعہ	جھنگ	دسمبر	"
"	الحق	اکوڑہ خٹک	نومبر و دسمبر	"
"	حور	لاہور	— "	"
"	الرشید	"	—	دسمبر ۱۹۷۹ء و جنوری ۱۹۸۰ء
"	سوداگر	کراچی	دسمبر ۱۹۷۹ء	— —
"	شام و سحر	لاہور	"	جنوری ۱۹۸۰ء
"	صدائے اسلام	پشاور	اکتوبر "	— —
"	طلوع اسلام	لاہور	دسمبر " جنوری	۱۹۸۰ء
سہ ماہی	العلم	کراچی	جولائی تا ستمبر	۱۹۷۹ء
ماہنامہ	فاران	"	نومبر و دسمبر	"

ماہنامہ	فکر و نظر	اسلام آباد	نومبر و دسمبر	۱۹۷۹ء
دو ماہی	فنون	لاہور	ستمبر اکتوبر	"
ماہنامہ	فیض الاسلام	راولپنڈی	دسمبر	"
"	قومی زبان	کراچی	اکتوبر، نومبر ۱۹۷۹ء و جنوری ۱۹۸۰ء	
"	کتاب	لاہور	نومبر ۱۹۷۹ء تا "	"
سہ ماہی	مجلہ تحقیق	"	جلد ۲ شمارہ ۲۵	
ماہنامہ	محدث	"	محرم و ربیع الاول ۱۴۰۰ھ	
"	المعارف	"	نومبر ۱۹۷۹ء تا جنوری	
"	میثاق	"	دسمبر	۱۹۷۹ء
"	نئی قدریں	حیدرآباد	۱۹۷۹ء	نمبر (۱، ۲)
"	الولی	"	اگست تا نومبر	۱۹۷۹ء
پندرہ روزہ	تعمیر حیات	لکھنؤ	۲۵ نومبر ۱۹۷۹ء تا جنوری ۱۹۸۰ء	
"	صحیفہ اہل حدیث	کراچی	۲۲ " " تا	" "
ہفت روزہ	الاسلام	لاہور	۷ دسمبر " تا	۲۵ " "
"	الاعتصام	"	" "	" "
"	الہام	بہاولپور	" "	۲۸ " "
"	الفات	راولپنڈی	۱۳ نومبر "	۲۶ " "
"	ترجمان اسلام	لاہور	۳۰ " "	۲۵ " "
"	چٹان	"	۳ دسمبر "	۲۸ " "
"	خدام الدین	"	۷ " "	۲۵ " "
"	کشمیر	مظفرآباد	۷ " "	۲۲ " "
"	لاہور	لاہور	۲ " "	۲۷ "
"	المنبر	لائل پور	۹ نومبر "	۱۷ " "
"	ہماری زبان	دہلی	۸ اکتوبر	۲۳ " "

قرۃ العین حیدر	کچھ عزیز احمد کے بارے میں	افکار	کراچی	دسمبر	۱۹۷۹ء ص ۲۱

قائد اعظمؒ

شبیر احمد قادری	قائد اعظم ایک تاریخ ساز شخصیت	چٹان	لاہور	۳۱ دسمبر	" ص ۳۴
محمود علی چودھری	قائد اعظم	العلم	کراچی	جولائی "	" ص ۱۱۲
مودودی، سید ابوالاعلیٰ	قائد اعظم، جسٹس منیر اور سیکولرازم	ترجمان القرآن	لاہور	دسمبر	" ص ۳۱

موجد - آرٹسٹ

احمد ندیم قاسمی	موجد - ایک سچا آرٹسٹ	افکار	کراچی	جنوری	۱۹۸۰ء ص ۲۴
تنویر، پروفیسر غلام رسول	موجد - سرورق کا ایک سحر کار	"	"	"	" ص ۲۰

یوسف حسین خاں

خلیق انجم، ڈاکٹر	ایک دیدہ ور کی موت	ہماری زبان	دہلی	۱۵ء "	" ص ۳
صباح الدین عبدالرحمن، سید	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	"	"	" "	" ص ۷
ضیاء الدین انصاری	یوسف صاحب کی تصانیف — ایک مختصر تعارف	"	"	" "	" ص ۴
ظل عباس عباسی	یوسف اردو غزل — تمید سے رباعی تک	"	"	" "	" ص ۱۶
عبدالمغنی، ڈاکٹر	یوسف حسین خاں — عالم یا ناقد	"	"	" "	" ص ۱۰
نارنگ، ڈاکٹر گوپی چند	ڈاکٹر یوسف حسین خاں سے ایک انٹرویو	"	"	" "	" ص ۱

ادبی شخصیات

ابوطاہر فارانی	فانی بدایونی	لاہور	لاہور	۶ء "	" ص ۱۰
اختر، ڈاکٹر محمد سلیم	عہد شاہجہانی کے بعض ممتاز مشاہیر	اردو	کراچی	جولائی	۱۹۷۹ء ص ۶۵
اشفاق احمد قاسمی	علامہ مناظر احسن گیلانی — اپنے مکاتیب کی روشنی میں	البلاغ	"	جنوری	۱۹۸۰ء ص ۲۳
اکبر شاہ بخاری محمد	مولانا شاہ محمد اسعد اللہ سہارنپوری	"	"	دسمبر	۱۹۷۹ء ص ۵۵

افسر صدیقی	اردو شعرائے برہان پور (۳)	اردو	کراچی	جولائی	۱۹۷۹ء	ص ۱۵
"	" " (۴)	"	"	اکتوبر	"	ص ۶۳
آفتاب احمد ردولوی، ڈاکٹر	تمکین کاظمی	"	"	"	"	ص ۳۱
تبسم کاشمیری، ڈاکٹر	شاگردانِ مصحفی	اورینٹل کالج میگزین	لاہور	فروری مئی	۱۹۷۸ء	ص ۱ تا ۶۲
" "	حالی اور نیا طرزِ احساس	قومی زبان	کراچی	جنوری	۱۹۸۰ء	ص ۵
ثریا جبین	ناصر کاظمی کی غزل	اکرم	"		۱۹۷۹ء	ص ۸۱
جعفر بلوچ	ریاض انور	شام و سحر	لاہور	"	۱۹۷۹ء	ص ۵
جمیل جالبی، ڈاکٹر	صادق نسیم کی شاعری	فنون	"	ستمبر	"	ص ۷۴
حسن اختر، ڈاکٹر ملک	مرزا محمد رفیع سودا	قومی زبان	کراچی	جنوری	۱۹۸۰ء	ص ۳۶
حیدر، خواجہ تصور علی	مولانا حالی کی اخلاقی قدریں	چٹان	لاہور	۲۷ دسمبر	۱۹۷۹ء	ص ۲۹
دین الحق، قاضی	مولانا غلام مرشد	طلوع اسلام	"		"	ص ۱۳
رشید نثار	گمشدہ منزل کا مسافر	ادب لطیف	"		۱۹۷۹ء، نمبر ۲۰۵	ص ۸
روشن اختر کاظمی	محروم کی سیاسی شاعری	ہماری زبان	دہلی	۲۲ اکتوبر	۱۹۷۹ء	ص ۵
ریاض صدیقی	آئن اسٹائن ـ ادب اور فنونِ لطیفہ	افکار	کراچی	دسمبر	"	ص ۳۵
سیف، محمد حنیف	مشینوں کا شہر ـ کرشن چندر کا سائنسی فنطاسیہ	ہماری زبان	دہلی	۲۲ نومبر	"	ص ۸
شاہد، خواجہ حمید الدین	ڈاکٹر زور مرحوم	العلم	کراچی	جولائی	"	ص ۴۲
صدیق الحسن نعمانی	پیر مہدی مجروح	لاہور	لاہور	۹ دسمبر	"	ص ۵
طاہرہ صدیقی، ڈاکٹر	رہی معیری ایران کا ایک جدید شاعر	اردو	کراچی	جولائی	"	ص ۱۰۹
طیب انصاری	پریم چند کا پس منظر	ہماری زبان	دہلی	۲۲ اکتوبر	"	ص ۱
عابد کمالوی	احسان دانش کے ساتھ ایک گفتگو	چٹان	لاہور	۱۷ دسمبر	"	ص ۲۷
"	عشرت رحمانی سے ایک انٹرویو	"	"	۳۱ "	"	ص ۲۰
"	مرزا ادیب سے ایک خصوصی انٹرویو	"	"	۷ جنوری	۱۹۸۰ء	ص ۱۲
"	کشور ناہید سے ایک گفتگو	"	"	۲۱ "	"	ص ۲۲
"	منیر نیازی " "	"	"	۲۸ "	"	ص ۲۲
عالم، سید	علامہ رضا علی وحشت	العلم	کراچی	جولائی	۱۹۷۹ء	ص ۹۸
عظیم قادری	ڈاکٹر محی الدین قادری	اکرم	"			ص ۶۷

علی احمد خاں، سردار	حضرت نظام الدین اولیاء دہلوی	فکر و نظر	اسلام آباد	نومبر دسمبر	۱۹۷۹ء	ص ۶۷
ف۔ا (فرید احمد)	رازق الخیری	چٹان	لاہور	۱۴ جنوری	۱۹۸۰ء	ص ۲۰
کاشف، مختار	امام بخاری — سید احمد شہید	فاران	کراچی	دسمبر	۱۹۷۹ء	ص ۲۷
کسری منہاس	علی جلیلی اور غزل	ادب لطیف	لاہور	۱۹۷۹ء نمبر ۳۔۲		ص ۲
کلیم اختر	ظفر علی خان	چٹان	"	۱۰ دسمبر	۱۹۷۹ء	ص ۲۱
" "	حسن کشمیر اور خوشحال خان خٹک	"	"	۲۱ جنوری	۱۹۸۰ء	ص ۲۶
کوثر القادری	شعری بھوپالی	الانسان	کراچی	"		ص ۱۲
مبارک علی	یوحن گاٹ فریڈ ہرڈر	قومی زبان	"	"		ص ۳۱
محمد اکبر شاہ بخاری، سید	تذکرہ اسلاف	الرشید	لاہور	دسمبر	۱۹۷۹ء	ص ۳۲
" " " "	" " "	"	"	جنوری	۱۹۸۰ء	ص ۳۶
محمد باقر لکھنوی	مولانا درد کاکوروی	العلم	کراچی	جولائی	۱۹۷۹ء	ص ۸۶
محمد صادق قصوری	ڈاکٹر طاہر فاروقی	"	"	"		ص ۷۷
محمد عثمان	مرغوب صدیقی	کشمیر	راولپنڈی	۱۱ دسمبر	"	ص ۲
محمد نعمان خان	کیا پریم چند بنیادی طور پر ہندی کے ادیب تھے	ہماری زبان	دہلی	۲۲ نومبر	"	ص ۳
محمد نعیم صدیقی ندوی، ڈاکٹر	سید سلیمان ندوی — شاعر کی حیثیت سے (۲)	تعمیر حیات	لکھنؤ	۲۵ نومبر	"	ص ۵
نسیم سوہدروی، حکیم راحت	مولانا ظفر علی خاں اور ان کا عہد	چٹان	لاہور	۲۴ دسمبر	"	ص ۲۲
" " "	مولانا محمد علی جوہر	"		۷ جنوری	۱۹۸۰ء	ص ۳۲
نشیط، سید یحیی	جبلی، صنعتی، صنیعتی	ہماری زبان	دہلی	۸ نومبر	۱۹۷۹ء	ص ۸
اظہر، ڈاکٹر، سید حسین	ابوریحان بیرونی	فکر و نظر	اسلام آباد	نومبر دسمبر	"	ص ۵۸
نظیر لودھیانوی	میر ضمیر مرحوم	شام و سحر	لاہور	نومبر	"	ص ۶۱

بزرگان دین

ارشاد احمد دیوبندی	مولانا محمد قاسم نانوتوی	ترجمان اسلام	"	۲۱ دسمبر		ص ۲۵
" " " "				۲۸ "		ص ۱۱
" " " "	"	"		۱۴ جنوری	۱۹۸۰ء	ص ۲۳
" " "	"	"		۱۱ "		ص ۵

ارشاد احمد دیوبندی	مولانا محمد قاسم نانوتوی	ترجمان اسلام	لاہور	۱۸ جنوری	۱۹۸۰ء	ص ۲۲
" " "	" " " (آخری قسط)	"	"	۲۵ "	"	ص ۷
ازہر، محمد حنیف	مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقی	العلم	کراچی	جولائی	۱۹۷۹ء	ص ۶۹
اسد نظامی	حضرت مولانا احمد رضا خاں کی دینی و سیاسی خدمات	الہام	بہاول پور	۷ جنوری	۱۹۸۰ء	ص ۵
اسعد گیلانی	سید اسمٰعیل شہید	محدث	لاہور	محرم	۱۴۰۰ھ	ص ۵۰
امتیاز احمد، ڈاکٹر	محدث امام زہری	صحیفہ اہل حدیث	کراچی	۲۲ نومبر	۱۹۷۹ء	ص ۱۴
" " "	" " "	"	"	۷ دسمبر	"	ص ۱۲
آسی نقشبندی، میاں فہیم احمد	خواجہ چوراہی (۱)	الہام	بہاول پور	۲۸ جنوری	۱۹۸۰ء	ص ۲
ریاض الانصاری	شیخ سعدالدین خیرآبادی	برہان	دہلی	جنوری	"	ص ۲۱
ساقی، ملک محمد اکبر	علامہ فضل حق خیرآبادی	الہام	بہاول پور	۱۴ "	۱۹۷۹ء	ص ۲
سعید الرحمن علوی، محمد	مولانا سید ابر علی ملیح آبادی	خدام الدین	لاہور	۲۸ ستمبر	"	ص ۲۳
سلیمان ندوی، مولانا سید	مولانا محمد الیاس کاندھلوی	البلاغ	کراچی	جنوری	۱۹۸۰ء	ص ۵۲
صفی الرحمن مبارک پوری، مولانا	شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب کا تصور سیاست	الاسلام	لاہور	۲۸ دسمبر	۱۹۷۹ء	ص ۱
" " "	" " "	"	"	۴ جنوری	۱۹۸۰ء	ص ۵
طاہر، محمد سلیم	مولانا سید محمد داؤد غزنوی	"	"	۱۸ "	"	ص ۹
عاطر، م۔ طیب	علامہ سید سلیمان ندوی	ترجمان اسلام	"	۷ دسمبر	۱۹۷۹ء	ص ۲۳
عبدالعزیز، میر	شیخ نورالدین نورانی	انصاف	راولپنڈی	۱۴ "	"	ص ۷
عرشی، علامہ	علامہ حکیم برکات احمد ٹونکی	فیض الاسلام	"		"	ص ۲۳
غلام حسین اندرابی، سید	شیخ مخدوم حمزہ رح	انصاف	"	۲۲ جنوری	۱۹۸۰ء	ص ۳
فرید احمد	قاضی احسان احمد	چٹان	لاہور	۳ دسمبر	۱۹۷۹ء	ص ۲۵
محمد یوسف بنوری، مولانا	مولانا عبدالرحمن کامل پوری	خدام الدین	"	۱۴ "	"	ص ۲۵
مقبول جہانگیر	حضرت مولانا خلیل صاحب سہارنپوری	ترجمان اسلام	"	۳۰ نومبر	"	ص ۱۵
نعیم ترین، دلسوز محمد	شاہ اسمٰعیل شہید رح اور مقام انبیا علیہم السلام	"		۴ جنوری	۱۹۸۰ء	ص ۲۰
نذیر حسین فریدی	حضرت خواجہ میاں علی محمد چشتی نظامی	الہام	بہاول پور	۲۱ دسمبر	۱۹۷۹ء	ص ۲

نفیس الحسنی، سید	سرحد کا ایک مجاہد عارف باللہ اخوند عبدالغفور	الحق	اکوڑہ	نومبر	۱۹۷۹ء ص ۴۲

تاریخی شخصیات

ابوطاہر فارانی	چنگیز خان	لاہور	لاہور	۲ دسمبر	" ص ۸
" " "	" " (آخری قسط)	"	"	۹ " "	" ص ۶
ایڈ. نصرت علی	سلیمان بن مہران الاعمش	المعارف	"	جنوری	۱۹۸۰ء ص ۵
احسان اللہ شریف	ٹیپو سلطان شہید	العلم	کراچی	جولائی	۱۹۷۹ء ص ۸۳
احمد سجاد بہار، ڈاکٹر	مولانا محمد علی کی شخصیت کے عناصر اربعہ	"	"	"	" ص ۹۱
آزاد، مولانا عبدالرحمن	مولانا محمد علی قصوری کی سرگزشت	المنبر	فیصل آباد	۲۷ دسمبر	" ص ۸۲
حسن علی عبدالرحمن	جسٹس طفیل علی عبدالرحمن	العلم	کراچی	جولائی	" ص ۴۳
خالدہ آفتاب، ڈاکٹر	گلبدن بیگم دختر بابر شاہ	مجلہ تحقیق	لاہور	جلد ۲ نمبر ۲	ص ۲۳
سالک، علم الدین	مراد بیگم عرف ملتانی بیگم	المعارف	"	نومبر	" ص ۲۱
سعید احمد اکبر آبادی، مولانا	وفیات. ظفر احمد خان شاہجہان پوری	برہان	دہلی	جنوری	۱۹۸۰ء ص ۵۶
صفدر سلیمی	سرسید کی عظمت	انصاف	راولپنڈی	۸ "	" ص ۷
ظہیر وارثی، احمد	مولانا محمد علی اور ریاست کی مالی امداد	جامعہ	دہلی	اکتوبر	۱۹۷۹ء ص ۵۲۲
غلام علی، ملک	عبداللہ بن ابی کا جنازہ	ترجمان القرآن	لاہور	نومبر	" ص ۳۷
محمد ریاض، ڈاکٹر	علامہ میرزا محمد خان قزوینی	المعارف	"	دسمبر	" ص ۱۳
محمد علی شاہ، سید	معاویہ بن یزید رض	پیام عمل	"	جنوری	۱۹۸۰ء ص ۲۱
مغموم، سید آغا حسینی	چودہری غلام عباس خان	کشمیر	راولپنڈی	۱۸ دسمبر	۱۹۷۹ء ص ۲
نجم السلام، ڈاکٹر	نواب شمس الدین اور ولیم فریزر	نئی قدریں	حیدرآباد	۱۹۵۹ء (نمبر ۱۱، ۲۰)	ص ۲۳
نفیر ادریس	پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام	لاہور	لاہور	۲۳ دسمبر	۱۹۷۹ء ص ۲۳
نعیم سلہری	پانچ مشہور عرب خواتین	"	"	"	" ص ۱۵

کتابیات

ابوسلمان شاہجہان پوری	نئے خزانے (مارچ ۱۹۷۹ء کے مضامین کا اشاریہ)	قومی زبان	کراچی	جنوری	" ص ۸۴

ابوسلمان شاہجہان پوری	نئے خزانے (جنوری ۱۹۷۹ء کے مضامین کا اشاریہ)	قومی زبان	کراچی	نومبر	۱۹۷۹ء	ص ۵۳
احمد خان	اندلس کا ایک متمول کتب خانہ	الحق	اکوڑہ خٹک	دسمبر	"	ص ۳۹
ارشد علی اسدی جیپوری	تصانیف مولانا شاغل جے پوری (۲)	العلم	کراچی	جولائی	"	ص ۲۹
افضل حق قریشی	سراج الاخبار (۲)	مجلہ تحقیق	لاہور	جلد ۲ نمبر ۲		ص ۱
جمیل احمد رضوی، سید	پنجاب یونی ورسٹی لائبریری مائیکروفلم اور روٹوگراف — کتابیاتی جائزہ	"	"	"		ص ۳۴
سجاد الرحمن	پاکستان میں تعلیمی کتب خانوں کی تعمیر و اصلاح	تعلیمات	"	اکتوبر	"	ص ۲۷۳
عبد اللطیف اعظمی	ماہنامہ جامعہ پر ایک نظر (جنوری ۱۹۲۳ء — جولائی ۱۹۷۷ء)	جامعہ	دہلی	"	"	ص ۲۷
نجمہ فرمان	ادب کی ترقی میں کتب خانوں کا کردار	اکرم	کراچی		"	ص ۸۵
نذیر احمد میاں	اشاریہ ماہنامہ کتاب ۱۹۷۹ء	کتاب	لاہور	دسمبر	"	ص ۷

مذہبیات

سیرت انبیا اور سیرت نبوی صلعم

اسرار احمد، ڈاکٹر	حیات طیبہ کا مکی دور	میثاق	لاہور	دسمبر	"	ص ۱۷
محمد حسنی ندوی، عبداللہ	تیسری عالمی سیرت کانفرنس منعقدہ قطر	تعمیر حیات	لکھنؤ	۲۵ "	"	ص ۵
" " "	" " " " (۲)	"	"	۱۰ جنوری	۱۹۸۰ء	ص ۱۱
محمد ریاض، ڈاکٹر	سیرت انبیاء کے ابدی نشانات	فکر و نظر	اسلام آباد	نومبر دسمبر	۱۹۷۹ء	ص ۸۲
مودودی، سید ابوالاعلیٰ	تذکرۂ انبیاء علیہم السلام	ترجمان القرآن	لاہور	دسمبر	"	ص ۹

قرآنیات: تفسیر اور دیگر مباحث

ابوالحسن علی ندوی مولانا	قرآنی مطالعہ اور اس کے ادب	"	"	۱ جنوری	۱۹۸۰ء	ص ۱۸
ظفر فریدی، نذیر حسین	قرآن پاک کی معجزانہ تاثیر	الہام	بہاول پور	"	"	ص ۲۰
ظفر ندوی، محمد فضل تدبیر	تفسیر سورۃ الجاثیہ	فیض الاسلام	راولپنڈی	دسمبر	۱۹۷۹ء	ص ۱۷

عبدالحکیم، خلیفہ	قرآن کریم کا علم النفس	المعارف	لاہور	دسمبر	١٩٧٩ء ص ٢٢
عبدالغفار حسن	درس سورہ تکاثر	میثاق	"	"	" ص ١
فدا، سید حسن شاہ	قرآن اور سائنسی نکات	فیض الاسلام	راولپنڈی	"	" ص ٢٧
عبدالروف رحمانی، مولانا	قرآن کریم کا ایک زندہ اعجاز	الاسلام	لاہور	١٨ جنوری	١٩٨٠ء ص ٥
محمد سعید دہلوی، حکیم	غذا اور قرآن مجید	الجامعہ	جھنگ	دسمبر	١٩٧٩ء ص ٦٢
محمد طیب، مولانا قاری	قرآن کریم کی عملی تفسیر	خدام الدین	لاہور	٢٥ جنوری	١٩٨٠ء ص ١١
محمد یونس جنجوعہ	قرآن اور آثار کائنات	میثاق	"	دسمبر	١٩٧٩ء ص ٤١

اسلام اور علوم جدیدہ

ذوالفقار علی ملک، ڈاکٹر	اسلام اور علوم جدیدہ	المعارف	"	نومبر	" ص ٥
زاہد الحق فریدی	اسلام اور جدید میڈیکل سائنس	خدام الدین	"	٧ دسمبر	" ص ١٩
" "	" " "	"	"	١٤ "	" ص ١٥
" "	" " "	"	"	٢٨ "	" ص ٢٥
" "	" " "	"	"	٤ جنوری	١٩٨٠ء ص ٢٧
" "	" " "	"	"	١٨ "	" ص ١٩
سلطان بخش	میڈیکل سائنس پر مسلمانوں کے احسانات	الہام	بہاولپور	٧ دسمبر	١٩٧٩ء ص ٤
عطش درانی	جدید سائنس کی بنیادیں (٥)	تعلیمات	لاہور	اگست	" ص ٢١٧

اسلام، قانون اور سیاسی نظام

زاہد الراشدی	اسلام کا عادلانہ نظام	ترجمان اسلام	"	٢١ دسمبر	" ص ١٥
سراج احمد فاروقی، مولانا	زمانہ جاہلیت میں عربوں کا نظام قانون اور اسلام	الولی	حیدرآباد	اکتوبر	ص ٣٦
سعید احمد اکبرآبادی، مولانا	علماء اور حکومت	خدام الدین	لاہور	١٨ جنوری	١٩٨٠ء ص ٢٧
صفی الرحمن مبارکپوری	اسلامی ہیئت اقتدار کی تشکیل اور سعودی حکومت	الاعتصام	"	٢٥ "	ص ٥
طیب شاہین لودھی	اجماع امت اور قانون سازی میں اس کی اہمیت	ترجمان القرآن	"	نومبر	١٩٧٩ء ص ٩

عبدالرحیم بیگ، مرزا	اسلام اور انسانی حقوق	الانسان	کراچی	اکتوبر	۱۹۷۹ء ص ۶۸
عتیق الرحمن، مفتی	اسلامی حکومت کا ایک بنیادی اصول۔ شوریٰ	ترجمان اسلام	لاہور	۱۴؍ دسمبر	″ ص ۸
مجیب الرحمن	اسلامی قانون تعزیرات	″	لاہور	۲۳؍ ″	″ ص ۷
محمد رفیع عثمانی، مولانا مفتی	اسلامی قانون شہادت اور ماہرین کی رپورٹیں	البلاغ	کراچی	جنوری	۱۹۸۰ء ص ۱۷
محمد لطیف	اسلام کا نظام حکومت و طریقِ انتخاب اولی الامر	فکر و نظر	اسلام آباد	نومبر دسمبر	۱۹۷۹ء ص ۶
محمود، مولانا مفتی	اسلامی ممالک میں اسلامی قانون سازی	ترجمان اسلام	لاہور	۱۴؍ دسمبر	″ ص ۷
منظور احمد	اسلامی طرز حکومت	الاسلام	″	۴؍ جنوری	۱۹۸۰ء ص ۱
″ ″	اسلام کا نظام قضا	″	″	۱۸؍ ″	″ ص ۱
″ ″	اراضی پاکستان میں عشر و خراج	″	″	۲۵؍ ″	″ ص ۱
منظور احمد، پروفیسر	اسلامی قانون اور اس کی تدوینِ جدید	ترجمان الحدیث	″	دسمبر	۱۹۷۹ء ص ۳۴
منظور احمد، حافظ	اسلامی قوانین میں حدیث کا مقام	محدث	″	ربیع الاول	۱۴۰۰ھ ص ۳۰
نعیم صدیقی	اسلامی ہیئت حاکمہ	ترجمان القرآن	″	نومبر	۱۹۷۹ء ص ۱۸

مسائل و مباحث متفرقہ

ابن الحق، مولانا سید	زمینداری کا شرعی نظام	خدام الدین	″	۱۸؍ جنوری	۱۹۸۰ء ص ۱۱
″ ″	″ ″ ″	″	″	۲۵؍ ″	″ ص ۱۶
پرویز	یتیم پوتے کی وراثت	طلوع اسلام	″	دسمبر	۱۹۷۹ء ص ۵۴
شاہ زر (ثاقب زیروی)	اسلام میں مسئلہ ربا	″	لاہور	۲؍ ″	″ ص ۵
ریاض حسین	اسلام کا نظریۂ ربا	الجامعہ	جھنگ	″	″ ص ۲۵
شہاب، مسعود حسین	تصویرِ شیخ	الہام	بہاولپور	۲۸؍ ″	″ ص ۲
طور، عبدالقیوم نون	عورت کی شہادت کا شرعی حکم	الاسلام	لاہور	۴؍ جنوری	۱۹۸۰ء ص ۷
عبدالرحیم پوپلزئی، مولانا مفتی	احکام تولیت وقف	صدائے اسلام	پشاور	اکتوبر	۱۹۷۹ء ص ۴۴
عبدالغفار خیری، ڈاکٹر	دین اور سیاست	صحیفۂ اہلِ حدیث	کراچی	یکم صفر	۱۴۰۰ھ ص ۷
عبدالقدوس ہاشمی	تلوار اور جبہ کی تاریخی حیثیت	البلاغ	″	دسمبر	۱۹۷۹ء ص ۵۵

مبارک علی خان، ڈاکٹر	صوفیہ کی روحانی سلطنت	نئی قدریں	حیدرآباد	۱۹۷۹ء نمبر ۱۱-۱۳	ص ۴۳
محمد ایوب قادری، پروفیسر	اسلام اور صنعت	المعارف	لاہور	دسمبر ۱۹۷۹ء	ص ۲۹
محمد حسین، مولانا ابوتراب	تحقیق تقلید	ترجمان الحدیث	"	"	ص ۳۹
محمد شمیم قاسمی	اسلام اور پردہ	صحیفہ اہل حدیث	کراچی	۱۶ صفر ۱۴۰۰ھ	ص ۹
محمد صدیق، مولانا ابوالکلام	محدث روپڑی کا ایک علمی و تحقیقی فتوی اور مولانا عزیز زبیدی کا تعاقب	محدث	لاہور	محرم ۱۴۰۰ھ	ص ۳۹
" "	" " " "	"	"	صفر "	ص ۳۳
" "	" " " "	"	"	ربیع الاول "	ص ۱۳
محمد ہاشم ٹھٹھوی، مخدوم	وسیلۃ الغریب الی جناب الحبیب صلی اللہ علیہ وسلم[1]	الولی	حیدرآباد	اگست ۱۹۷۹ء	ص ۵
"	" " " (۳)	"	"	اکتوبر "	ص ۵
محمد یوسف لدھیانوی، مولانا	اختلاف امت اور صراط مستقیم	الرشید	لاہور	دسمبر "	ص ۵
" "	" "	"	"	جنوری ۱۹۸۰ء	ص ۱۹
مروت، پروفیسر غلام ناصر	اسلام میں عورت کا مقام	صدائے اسلام	پشاور	اکتوبر ۱۹۷۹ء	ص ۳۶
مسعود احمد	حدیث حجت شرعیہ ہے	محدث	لاہور	صفر ۱۴۰۰ھ	ص ۲
———	فرض نمازوں کے بعد مروجہ طریقہ سے دعا کا مسئلہ[2] (۲)	الاعتصام	"	۲۱ دسمبر ۱۹۷۹ء	ص ۶
———	" " (۳)	"	"	۳۰ " "	ص ۹
———	" " (۴)	"	"	۴ جنوری ۱۹۸۰ء	ص ۱۵
———	" " (۵)	"	"	۱۸ " "	ص ۱۰

---

[1] ترجمہ بعنوان فضائل و تاریخ اہل بیت از مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی صاحب۔

[2] ایک تحریری علمی مذاکرہ جس میں متعدد علمائے دین نے حصہ لیا۔

اردو کی نثری داستانیں

تحریر

ڈاکٹر گیان چند

کچھ دن بچائیے تاابد کمائیے

پہلی ایکم: صرف ۶۶ مہینوں تک ایک مقررہ رقم ماہ بہ ماہ جمع کیجئے اور ۱۰۱ روپے ماہانہ فی سیکڑہ ابدی طور پر کمائیے ـــــ نسلاً بعد نسلاً۔

دوسری ایکم: اگر آپ ۱۰۸ مہینوں تک مقررہ رقم ماہ بہ ماہ جمع کرتے ہیں تو آپ کو ۲۱۲ روپے فی سیکڑہ ماہانہ تاابد حاصل ہوتے رہیں گے، یعنی نسلاً بعد نسلاً۔

نیشنل بینک آف پاکستان کے یہ منصوبے آپ اور آپکے ورثاء کیلئے مستقل ماہانہ آمدنی کا ذریعہ ہیں۔

منصوبے کی اہم خصوصیات:

- یہ آپ کی مرضی پر منحصر ہے کہ آپ مقررہ رقم ۶۶ مہینوں کے لئے جمع کرتے ہیں یا ۱۰۸ مہینوں کے لئے۔
- بعد از اختتام مدت آپ کچھ بھی ادا نہیں کریں گے، بلکہ اب بینک کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ آپ کو ادائگی کرتا رہے۔
- فرض کیجئے آپ نے پہلی ایکم پسند کی ہے تو ہر ماہ ۱۰۰ روپے جمع کرنے پر ۶۶ ماہ بعد نیشنل بینک آپ کو اور آپکے ورثاء کو ۱۰۱ روپے ماہانہ ادا کرتا رہے گا، اور اگر آپ نے دوسری ایکم منتخب کی ہے تو صرف ۱۰۸ ماہ بعد اسی ۱۰۰ روپے ماہوار ادا کرنے کے عوض نیشنل بینک آپکو اور آپکے ورثاء کو تاابد ۲۱۲ روپے ماہانہ ادا کرتا رہے گا۔
- آپ دس روپے سے بھی اس ایکم میں حصہ لے سکتے ہیں۔
- پہلی ادائگی کے چھ ماہ بعد آپ جب بھی چاہیں ایکم سے علیحدہ ہو سکتے ہیں، اس صورت میں آپکی کل جمع شدہ رقم بمعہ منافع آپکو واپس کردی جائے گی۔
- یہ ماہوار آمدنی آپکے ورثاء کو بھی اسی طرح ادا کی جاتی رہیگی جسطرح آپکو اور ورثاء کے ورثاء کو بھی۔
- اپنی جمع شدہ رقم پر آپکو قرضے کی سہولت بھی حاصل ہوگی۔
- آپ جب چاہیں پہلی ایکم کو دوسری اور دوسری ایکم کو پہلی میں تبدیل کر سکتے ہیں۔
- اگر ایکم میں شرکت کے بعد کسی وجہ سے کچھ عرصے تک آپ کے لئے ادائگی ممکن نہ ہو (یہ عرصہ چھ ماہ سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے) تو آپ واجب الادا رقم اور اس عرصے کا منافع ادا کر کے اپنی ایکم کو معمول کے مطابق جاری رکھ سکتے ہیں۔

تفصیلات کے لئے نیشنل بینک آف پاکستان کی کسی بھی شاخ سے رابطہ قائم کیجئے

قومی ترقی۔ قومی بینک

نیشنل بینک آف پاکستان

DONATE BLOOD

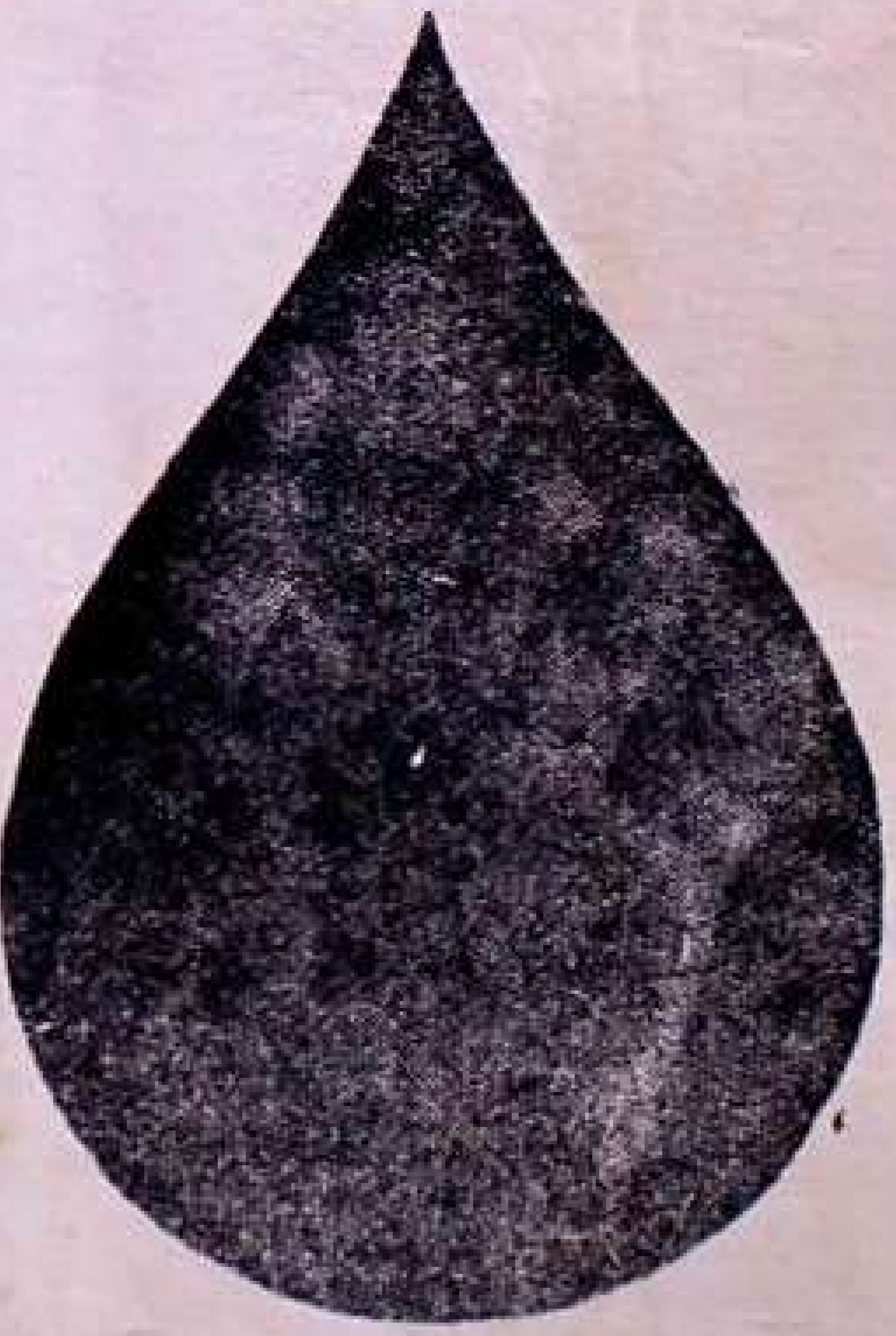

help
save a
human
life

PBS Pakistan Burmah Shell

1138 Regd. S. No. Phone : 217137

Monthly **QAOMI ZABAN** Karachi

مدیر :- شبیر علی کاظمی۔ کلیم الحسن نقوی کے زیر اہتمام انجمن پریس کراچی میں چھپ کر
انجمن ترقی اردو (پاکستان) - بابائے اردو روڈ - کراچی سے شائع ہوا -